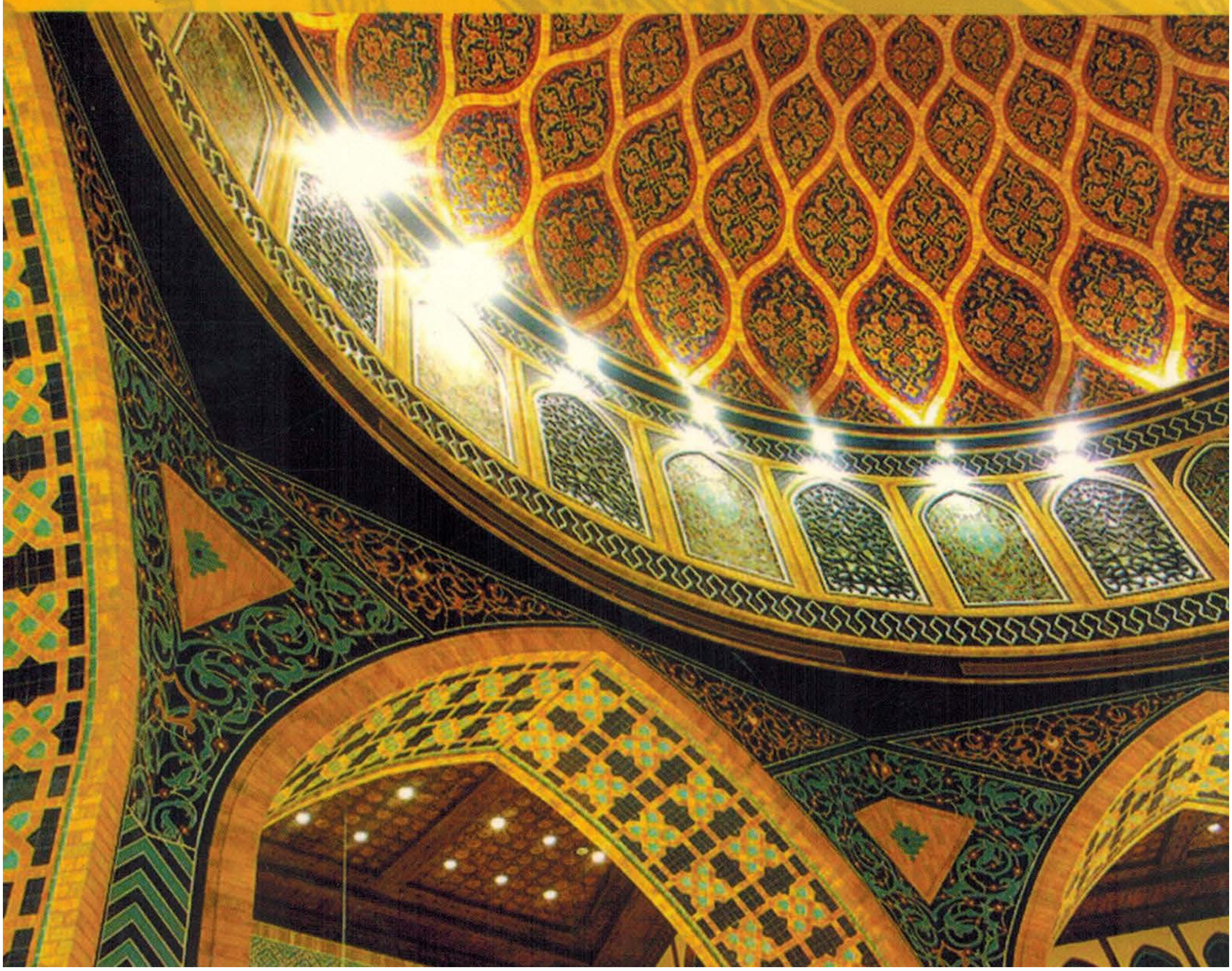
انسان کی منزل

مولانا وحید الدّین خاں



انسان کی منزل

مولانا وحید الدین خاں

GOODWORD

فہرست

باب سوم

باب چہارم

آغازِ کلام

انسانی وجود ایک مکمل وجود ہے۔ تاہم اس کے دو حصے ہیں— مادی وجود اور روحانی وجود۔ مادی وجود سے مراد انسان کا ظاہری جسم ہے، اور روحانی وجود سے مراد اس کی داخلی شخصیت۔ دونوں ہی حصے اپنی جگہ پر اہم ہیں، مگر دونوں کی حیثیت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

موجودہ زمانے میں جو تمدنی ترقیاں ہوئی ہیں اس نے انسان کے مادی حصے کے لیے بہت زیادہ سامان فراہم کیا ہے۔ اس کے بعد انسان کی خارجی شخصیت کے ڈیولپمنٹ میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ خارجی شخصیت کی خوشنمائی، اس کی صحت مندی، اور اس کی راحتوں اور آسائشوں میں اتنی زیادہ ترقی ہوئی ہے جو اس سے پہلے تاریخ کے کسی دور میں نہیں ہوئی تھی۔

مگر جہاں تک انسان کی داخلی شخصیت کی بات ہے اس میں برعکس طور پر، کوئی قابل لحاظ ترقی نہ ہوسکی۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان کی داخلی شخصیت ایک قسم کے فاقہ (starvation) میں مبتلا ہے۔ ظاہری طور پر خوشنما جسموں کے اندر ایک غیر صحت مند روح چھپی ہوتی ہے۔

انسانی شخصیت کے اس تضاد کو سمجھنا اور اس کا حل دریافت کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ انسان کی حیثیت جنگل کے اس جانور کی ہو جائے گی جو ہرا ہرا چارہ کھا کر جسمانی طور پر فربہ ہوگیا ہو لیکن اندر سے وہ ایک حیوانی وجود کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

انسان کو اس بحران سے بچانا فوری طور پر ضروری ہے۔ اس بحران کا سب سے زیادہ سنگین پہلو یہ ہے کہ انسان کی جسمانی فیکلٹی تو خوب کام کر رہی ہے مگر اس کی دماغی فیکلٹی تقریباً معطّل پڑی ہوئی ہے۔ انسان اپنے جسم کے نظام ہضم میں خوراک ڈالتا ہے اور اس کے ہضم کا نظام سرگرم ہو کر اس کو کامیابی کے ساتھ گوشت اور خون میں کنورٹ کرتا ہے۔

اسی طرح انسان کا دماغ بھی فطرت کا ایک معجزاتی کارخانہ ہے۔ دماغ یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ خارجی معلومات کا تجزیہ کر کے ان سے اعلیٰ نظامِ افکار بنائے۔ وہ حکمت کے اعلیٰ مرتبے کو حاصل

کرے۔مگر انسانی دماغ کا یہ معجزاتی کارخانہ موجودہ زمانے میں اپنا کام بہت کم کر پایا ہے۔

اس محرومی کا سبب یہ ہے کہ آج کے انسان کے پاس اپنے جسم کے تقاضے پورا کرنے کا وقت ہے مگر اس کے پاس اپنے ذہن کے تقاضے پورا کرنے کا وقت نہیں۔آج کا انسان اعلیٰ حقائق پر سوچنے سے معذور ہے۔آج کے انسان کے پاس کتابوں کے مطالعے کا وقت نہیں۔حالاں کہ کتابوں کے مطالعے کا مطلب ہے تاریخ کے اعلیٰ انسانوں کی صحبت میں بیٹھنا اور ان سے تبادلۂ خیال کرنا اور اس طرح اپنے ذہنی ارتقاء (intellectual development) کا سامان کرنا۔

زیرِنظر کتاب کا مقصد اسی ضرورت کی طرف انسان کو متوجہ کرنا ہے۔اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے وجود کے جسمانی حصے کی ضرورت کو پورا کرنے کے ساتھ اپنے وجود کے دوسرے حصے کے تقاضے بھی پورے کرے۔دونوں اعتبار سے وہ اپنی شخصیت کو ترقی یافتہ شخصیت (developed personality) بنانے کا اہتمام کرے۔وہ اپنی ہستی کے پوٹنشیل کو پوری طرح واقعہ بنا سکے۔

نئی دہلی ۲۵ نومبر ۲۰۰۵ — وحید الدین

باب اوّل

سچائی کی تلاش

ہر آدمی جو اِس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے اور اپنی زندگی کے بارے میں سوچنا شروع کرتا ہے، اس کے ذہن میں سب سے پہلے یہ سوال آتا ہے کہ میں کون ہوں (Who am I)۔ یہ سوال ہر عورت اور مرد کے ذہن میں موجود رہتا ہے، خواہ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر۔

افکار کی تاریخ (History of Thought) براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اسی تلاش کا دوسرا نام ہے۔ مختلف پہلوؤں سے تمام ذہن اسی حقیقت کی تلاش کرتے رہے ہیں کہ انسان کیا ہے، وہ کیسے پیدا ہوا۔ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے، موت سے پہلے کیا ہے اور موت کے بعد کیا، کامیاب کون ہے اور ناکام کون، حق کیا ہے اور باطل کیا۔ یہی وہ سوالات ہیں جن کو حقیقت کی تلاش کہا جاتا ہے، اور حقیقت کی تلاش ہی تمام انسانوں کی توجّہ کا سب سے بڑا مرکز رہا ہے۔ یہ تلاش سب سے پہلے فلسفے کے ذریعے شروع ہوئی۔ مگر ہزاروں سال تک بڑے بڑے اہلِ دماغ کی محنت کے باوجود فلسفہ اس معاملے میں کسی مثبت جواب تک نہ پہنچا۔ وہ صرف اختلافی بحثوں کا علم بن کر رہ گیا۔

اسی طرح روحانیت (spirituality) کے میدان میں لمبی مدت تک کوشش جاری رہی، مگر یہ کوشش بھی عملاً ناکام ہوکر رہ گئی۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ روحانی اشخاص مراقبے اور میڈیٹیشن کے ذریعے سچائی کو ''دل کی دنیا'' میں تلاش کرتے رہے۔ مگر اس معاملے میں انھیں کوئی کامیابی نہ ہوسکی۔ اس کی سادہ وجہ یہ تھی کہ دل صرف گردشِ خون کا ایک آلہ تھا۔ حق کی معرفت یا سچائی کا شعور دل کے اندر سرے سے موجود ہی نہ تھا، پھر وہ تلاش کرنے والوں کو اس میں کہاں ملتا۔

یہی معاملہ سائنس کا ہے۔ سائنس کے علم نے موجودہ زمانے میں بہت زیادہ اہمیت حاصل کی۔ ابتدائی طور پر لوگوں نے یہ گمان کرلیا تھا کہ سائنس سچائی کی تلاش کا جواب فراہم کرنے میں کامیاب ہوجائے گی۔ مگر جلد ہی سائنس نے اپنی تلاش اور جستجو کے دائرے کو محدود کرلیا۔ سائنس دانوں نے اپنی تحقیق کے دوران پایا کہ زندگی کے فکری اور نظریاتی سوالات کا جواب پانا ان کے لیے

بھی اسی طرح ناممکن ہے جس طرح وہ فلسفیوں کے لیے ناممکن ثابت ہوا تھا۔ چنانچہ انھوں نے فکری سوالات سے الگ کر کے صرف مادّی چیزوں کی تحقیق تک اپنے آپ کو محدود کرلیا۔ اس طرح یہ واضح ہوگیا کہ سائنس کے ذریعے سچائی کی تلاش کا جواب پانا کسی بھی شخص کے لیے ممکن نہیں۔

اس معاملے میں آخری دائرہ مذہب کا ہے۔ مذہب کا کام اصلاً یہی ہے کہ وہ انسان کو بتائے کہ سچائی کیا ہے، وہ کائنات کے اندر انسان کے مقام کو متعین کرے۔ مذاہب اسی لیے آئے کہ وہ انسان کو اس کے اس سوال کا جواب دیں۔ مگر مذاہب کی موجودہ صورت کو دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذاہب بعد کے دَور میں تبدیلی اور تحریف کا شکار ہوگیے۔ اب ضورت یہ ہے کہ مذہب کا ازسرنو مطالعہ کیا جائے۔ مذہب کو اس کی حقیقی صورت میں ازسرِ نو دریافت (re-discover) کیا جائے۔

سچائی کی تلاش کا جواب پانے کے لیے فلسفہ اور سائنس اور روحانیت فیل ہوچکے تھے۔ اس کے بعد صرف مذہب باقی رہ جاتا ہے جہاں اس سوال کا جواب دریافت کیا جائے۔ جو لوگ مذہب کو نہیں مانتے، اور جو لوگ مذہب کو مانتے ہیں دونوں ہی اس معاملے میں یکساں طور پر ایک مشترک مقام پر کھڑے ہوئے ہیں۔ دونوں ہی کو یکساں طور پر یہ کرنا ہے کہ وہ مذہب کے ذریعے مطلوب سچائی کو ازسرِ نو دریافت کریں۔ فرق صرف یہ ہے کہ منکرِ مذہب کے لیے یہ دریافت اگر ڈسکوری ہوگی تو مؤمنِ مذہب کے لیے وہ ری ڈسکوری کے ہم معنیٰ ہوگی۔

مذہب سے مراد، مذہب کا مروّجہ فارم نہیں ہے۔ مذہب کا مروّجہ فارم دراصل مذہب کا کمتر فارم (reduced form) ہے۔ یہ مذہب کی وہ شکل ہے جو بعد کی نسلوں میں اُس وقت بنی جب کہ اہلِ مذہب زوال کا شکار ہوگیے۔ اب جو شخص کسی مذہبی سماج میں پیدا ہوتا ہے وہ مذہب کے نام سے اِسی کمتر فارم کو جانتا ہے۔ وہ متعصّبانہ حد تک اسی کمتر فارم سے مانوس ہوجاتا ہے۔ اس لیے مذہب کی اصل صورت کو جاننے کے لیے ضرورت ہے کہ آدمی تعصّبات کے اِن پَردوں سے باہر آئے۔ وہ مذہب کے بگڑے ہوئے فارم سے گذر کر مذہب کی اصل صورت کو دریافت کرے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ہم نے مذہب کی ری ڈسکوری کہا ہے۔ اِس ری ڈسکوری کے بغیر مذہب کی حقیقی اہمیت کو سمجھنا ممکن نہیں۔

سچائی—— ایک مطالعہ

کہا جاتا ہے کہ سچائی مطلق چیز نہیں—— ہر آدمی کی سچائی الگ الگ ہے۔ جو چیز کسی ایک کے لیے سچائی ہو وہی چیز دوسرے کے لیے سچائی نہیں ہوسکتی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ سچائی ایک ریلیٹیو (relative) چیز ہے، وہ کوئی رِیَل (real) چیز نہیں۔ اس بات کو ایک فلسفی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

There is no full stop in truth, but only camas.

کچھ لوگ اس طرح سوچتے ہیں۔ مگر یہ ایک ایسی سوچ ہے جو بداہتاً ہی غلط ہے۔ اس قسم کے مفروضے کے پیچھے کوئی لاجک یا کوئی ریشنل گراؤنڈ نہیں۔

اس دنیا میں آدمی جن چیزوں کو بھی مانتا ہے اُن کو وہ مطلق مفہوم میں مانتا ہے۔ یہی انسان کی فطرت ہے۔ اگر انسان کسی چیز کو اس کے مطلق مفہوم میں دریافت نہ کرے تو وہ مسلسل اُس وقت تک اپنی تلاش جاری رکھتا ہے جب تک وہ اُس چیز کو اُس کی مطلق صورت میں دریافت نہ کرلے۔

مثال کے طور پر قدیم زمانے میں انسان سورج اور شمسی نظام کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔ وہ ہزاروں سال تک اُس کی کھوج میں لگا رہا۔ یہاں تک کہ انسان نے سورج اور اس کے تابع سیاروں کے پورے نظام کو دریافت کرلیا۔ جب تک انسان اس دریافت تک نہیں پہنچا تھا وہ برابر اس کی تلاش میں لگا رہا۔

یہی معاملہ علم کے دوسرے شعبوں کا ہے۔ ہزاروں سال سے انسان علم کے مختلف شعبوں میں بحث وتحقیق میں مشغول رہا ہے اور بدستور مشغول ہے۔ وہ اُس وقت تک اپنی تحقیق جاری رکھتا ہے جب تک اُس کی اصل حقیقت کو معلوم نہ کرلے۔ گویا انسان کے نزدیک ہر چیز کی ایک مطلق صورت ہے۔ ستاروں سے لے کر ایٹم تک کسی چیز کا اس میں استثناء نہیں۔

گویا انسانی ذہن کے مطابق، ہر چیز اپنی ایک مطلق صورت رکھتی ہے۔ یہی وہ یقین ہے جس کی بنا پر ہزاروں سال سے تحقیق اور جستجو کا عمل جاری ہے۔ اگر انسان یہ مان لے کہ چیزوں کا کوئی مطلق

فارم نہیں تو اچانک تمام سائنسی سرگرمیاں ٹھپ ہو جائیں گی۔ علم کا سفر ہمیشہ کے لیے رُک جائے گا۔

یہی اُصول ذاتی معاملات کا ہے۔ انسان اپنے آپ کو مطلق سمجھتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ سمجھے تو وہ ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکے۔ انسان اپنی ماں، اپنی بیوی، اپنی اولاد کو مطلق سمجھتا ہے۔ اسی تصور پر خاندان کا نظام قائم ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسانی زندگی کا سارا نظام بکھر کر رہ جائے۔ اسی طرح انسان اپنی پراپرٹی، مثلاً گھر اور کار اور بزنس اور بینک بیلنس کو مطلق سمجھتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ سمجھے تو اس کی معاشی زندگی کبھی تشکیل نہ پا سکے گی۔

ایسی حالت میں یہ ماننا کہ سچائی مطلق نہیں، گویا یہ ماننا ہے کہ سچائی کی حیثیت ایک استثنا کی ہے۔ گویا کہ سچائی مطلق دنیا میں ایک غیر مطلق (non-absolute) کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر اس قسم کے عقیدے کے لیے کوئی منطقی بنیاد موجود نہیں۔ یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ اس وسیع دنیا میں دوسری تمام چیزیں تو مطلق ہوں، مگر سچائی استثنائی طور پر مطلق نہ ہو۔ یہ ایک منطقی تضاد ہے اور اس قسم کا منطقی تضاد عقل وفہم والے انسان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ غور کیجئے تو انسان ایک دہرا وجود ہے— جسم اور روح۔ سچائی کے سوا جتنی چیزیں ہیں وہ سب کی سب انسان کی جسمانی ضرورت سے تعلق رکھتی ہیں۔ سچائی واحد چیز ہے جو انسان کو اپنی روحانی ضرورت کے طور پر مطلوب ہے۔ اب یہ ناقابلِ فہم ہے کہ جسم کی ضرورت پوری کرنے کے لیے جو چیزیں اس دنیا میں ہیں وہ تو سب کی سب مطلق ہوں۔ مگر سچائی، جو انسان کی روحانی ضرورت کو پورا کرتی ہے وہ مطلق نہ ہو۔

اس تقسیم کو ماننے کے لیے یہ ماننا پڑے گا کہ اس دنیا میں ایک بہت بڑا تضاد ہے۔ یہاں مادی ضرورتوں کا سامان مطلق حیثیت سے موجود ہے۔ مگر روحانی ضرورت کا سامان استثنائی طور پر ایک ایسی چیز ہے جس کی تکمیل کا سامان مطلق حیثیت سے دنیا میں موجود ہی نہیں۔

ایک فلسفی جو سچائی کو مانتا تھا، اُس نے اپنے نقطۂ نظر کے حق میں دلائل پیش کرتے ہوئے کہا کہ سچائی انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ سچائی کے بغیر انسان سرتاسر نامکمل ہے۔ سچائی انسان کی

اتنی بڑی ضرورت ہے کہ اگر وہ مطلق نہ ہوتو ہم کو مفروضہ طور پر یہ یقین کرنا پڑے گا کہ سچائی مطلق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سچائی کو مطلق نہ ماننا ایک ذہنی خودکشی ہے۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ اپنے اس قول میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔ اگر وہ سنجیدہ ہوں تو کبھی وہ ایسا لفظ اپنے منھ سے نہ نکالیں۔

سچائی کو مطلق نہ ماننا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ میں اپنی ماں کو مطلق مفہوم میں اپنی ماں نہیں مانتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہوسکتا ہے کہ وہ میری ماں ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ میری ماں نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی سنجیدہ انسان غیر مطلقیت (non-absolution) کے اس نظریے کا تحمل نہیں کرسکتا۔ ٹھیک اسی طرح کوئی سنجیدہ انسان اس کا بھی تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ کہے کہ سچائی میرے نزدیک کوئی مطلق چیز نہیں۔ سچائی تو صرف ایک ریلیٹیو چیز ہے۔ یعنی A بھی سچائی ہوسکتی ہے اور B بھی اور اسی طرح C اور D بھی۔ یہاں تک کہ Z تک ہر چیز سچائی ہوسکتی ہے۔

یہاں تک یہ بھی ممکن ہے کہ اے سے زیڈ تک کوئی بھی سچائی نہ ہو۔ بلکہ سچائی ان کے سوا کوئی اور ہو، یا سچائی، سرے سے کوئی چیز ہی نہ ہو۔ یہ بلاشبہہ ایک ایسا ذہنی تعیش (intellectual luxury) ہے جس کا کوئی سنجیدہ انسان کبھی تحمل نہیں کرسکتا۔

سنجیدہ طور پر کوئی شخص یہ تو کہہ سکتا ہے کہ میں نے ابھی سچائی کو نہیں پایا۔ میں ابھی صرف متلاشی (seeker) ہوں۔ مگر کوئی شخص سنجیدہ طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ سچائی کوئی مطلق چیز ہی نہیں۔

انسان جس کائنات میں رہتا ہے وہاں ہر چیز مطلق ہے۔ یعنی ایک اسٹار اسٹار ہے وہ کوئی ہاتھی نہیں۔ اسی طرح ایک ہاتھی ہاتھی ہے وہ کوئی اسٹار نہیں۔ اسی طرح ہر چیز معلوم طور پر ایک مطلق چیز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اگر کوئی چیز مطلق حیثیت سے معلوم نہ ہوئی ہو تو انسان لگاتار اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ اس کو مطلق حیثیت میں دریافت کرلے۔

یہی معاملہ خود انسان کی شخصیت کا ہے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے مطلق پسند انسان ہے۔ وہ یقین میں جینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جب وہ ایک عورت کو ماں کی حیثیت سے جانے تو وہ مطلق طور پر اس کے ماں ہونے پر یقین کرسکے۔ اسی طرح جب وہ ایک پراپرٹی کو اپنی پراپرٹی کی

حیثیت سے جانے تو وہ مطلق مفہوم میں یقین کر سکے کہ وہ اسی کی پراپرٹی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو انسان ہر چیز کے بارے میں غیر یقینیت (uncertainty) میں مبتلا رہے گا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان غیر یقینیت میں نہیں جی سکتا۔

یہ حقائق واضح طور پر بتاتے ہیں کہ مطلق کا تصور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس کے برعکس یہ سمجھنا فطری تقاضے کے خلاف ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز مطلق نہیں۔

سچائی کو مطلق نہ سمجھنا گویا یہ کہنا ہے کہ میں کسی چیز کے برحق ہونے پر یقین نہیں رکھتا۔ اس قسم کے کسی تصور کو لے کر کوئی آدمی صرف متشکک (sceptic) بن سکتا ہے، اور متشکک بننا کسی بھی انسان کے لیے قابل عمل پوزیشن نہیں۔

فطرت اور انسان

موجودہ دنیا میں آدمی اپنے آپ کو نیچر (فطرت) کے درمیان پاتا ہے۔ سورج اور چاند، ستارے اور سیارے، پہاڑ اور سمندر، ہوا اور پانی، سبزی اور صحرا، پرندے اور جانور وغیرہ۔ انسان جب اپنے گردوپیش کی اس دنیا کو دیکھتا ہے تو وہ سخت حیرانی میں پڑ جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم زمانے کا انسان نیچر کو مقدس سمجھنے لگا تھا۔ اس سے فطرت پرستی (Nature worship) کا عقیدہ پیدا ہوا۔ انسان نیچر کو خدا سمجھ کر اس کو پوجنے لگا۔ اس عقیدے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے ہزاروں سال سے انسان نیچر کو اپنی زندگی کی تعمیر کے لیے استعمال نہ کر سکا۔ وہ نیچر کی تحقیق کر کے اس کے اندر چھپی ہوئی طاقتوں کو استعمال نہ کر سکا۔ وہ نیچر کے درمیان رہتے ہوئے نیچر کو اپنے لیے نفع بخش نہ بنا سکا۔ کیوں کہ جس چیز کو انسان مقدس سمجھنے لگے اس کو دیکھ کر انسان کے اندر پرستش کا جذبہ ابھرے گا نہ کہ تحقیق و تفتیش کا جذبہ۔ پچھلے ہزار سال کے دوران انسان کے اندر ایک نیا ذہن پیدا ہوا۔ وہ ذہن یہ تھا کہ نیچر معبود نہیں ہے بلکہ وہ مخلوق ہے ٹھیک اسی طرح جیسے کہ انسان ایک مخلوق ہے۔ اس ذہن کے بعد یہ ہوا کہ نیچر انسان کے لیے تحقیق و تفتیش کا ذریعہ بن گئی۔

اب دھیرے دھیرے ایک نیا عمل شروع ہوا۔ یہ وہی عمل تھا جس کو موجودہ زمانے میں نیچر پر کنٹرول کہا جاتا ہے۔ انسان کی کھوج نے اُس پر اس حقیقت کو منکشف کیا کہ نیچر کے اندر مختلف قسم کی طاقتیں چھپی ہوئی ہیں۔ اب انسان کوشش کرنے لگا کہ ان طاقتوں کو دریافت کرے اور ان کو اپنے حق میں استعمال کرے۔

اس طرح ایک نیا انقلاب شروع ہوا۔ اس نے دھیرے دھیرے پوری انسانی زندگی کا نقشہ بدل دیا۔ بیسویں صدی تک پہنچ کر نیچر کے اندر چھپی ہوئی یہ دنیا پوری طرح انسان کے سامنے آ گئی۔ اس طرح وہ دنیا بنی جس کو جدید تمدنی دنیا کہا جاتا ہے۔

بظاہر ان دنوں دنیاؤں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ پہلے اگر نیچر کی پرستش تھی تو اب انسان کو نیچر پر تحکم کا مقام حاصل ہو گیا ہے۔ لیکن ایک اور پہلو سے دیکھئے تو قدیم دور اور جدید دور میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ یہ پہلو ہے نیچر اور انسان کے درمیان صحیح تعلق کو دریافت کرنا۔ اس دوسرے اعتبار سے قدیم دور کا انسان بھی نیچر کے ساتھ اپنے حقیقی تعلق کو دریافت کرنے میں ناکام رہا تھا اسی طرح موجودہ زمانے کا انسان بھی نیچر کے ساتھ اپنے حقیقی تعلق کو دریافت کرنے میں بدستور ناکام رہا ہے۔ اس طرح قدیم دور کے انسان کا کیس بھی بے خبری کا کیس تھا اور جدید دور کے انسان کا بھی۔

قدیم زمانے کے انسان کی یہ غلطی تھی کہ اس نے نیچر کو اپنا خدا سمجھ لیا۔ حالانکہ نیچر بھی اسی طرح خالق کی مخلوق تھی جس طرح خود انسان خالق کی مخلوق۔ اس غلطی کے نتیجے میں انسانی سماج میں وہ برائی پیدا ہوئی جس کو توہم پرستی (superstition) کہا جاتا ہے۔ مثلاً سورج گرہن اور چاند گرہن جو فلکیاتی قوانین کے تحت پیش آنے والے واقعات تھے، ان کے بارے میں وہ عجیب وغریب قسم کے توہماتی عقائد میں مبتلا ہو گیا۔ یہاں تک کہ انسان کا مذہب اور اس کا کلچر مکمل طور پر توہم پرستی کے رنگ میں رنگ گیا۔

اس معاملے میں جدید انسان کا کیس بھی وہی ہے جو قدیم انسان کا کیس تھا۔ دونوں کے درمیان جو فرق ہے وہ صرف ظاہر کے اعتبار سے ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

قدیم انسان کی یہ غلطی تھی کہ وہ فطرت کو خدا سمجھ بیٹھا تھا۔ جدید انسان کی غلطی دوبارہ یہ ہے کہ اس نے نیچر ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ اس نے جب نیچر میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ نیچر کے اندر بے شمار طاقتیں چھپی ہوئی ہیں۔ نیچر کے اندر اسٹیم انجن چھپا ہوا ہے۔ نیچر کے اندر موٹر کار اور ہوائی جہاز چھپا ہوا ہے۔ نیچر کے اندر ٹیلی گراف اور ٹیلی فون چھپا ہوا ہے۔ نیچر کے اندر ریڈیو اور ٹیلی ویژن چھپا ہوا ہے، نیچر کے اندر موبائیل اور کمپیوٹر چھپا ہوا ہے۔ غرض نیچر کے اندر ایک پورا تمدن چھپا ہوا ہے۔ جو انسان کی زندگی کو حیران کن حد تک پرکشش بنانے والا ہے۔

نیچر کو دریافت کر کے نئے تمدن کی تعمیر انسان کی غلطی نہیں تھی۔ مگر اس سلسلے میں انسان نے یہ بھیانک غلطی کی کہ اس نے نعمت (blessing) کو تو بھر پور طور پر لیا مگر اس نے مُنعم (Benifactor) کو مکمل طور پر فراموش کر دیا۔ فطرت کا یہ تمدنی دسترخوان خالق نے بچھایا تھا۔ جب انسان کو اس دسترخوان کی دریافت ہوئی تو وہ اس پر ٹوٹ پڑا۔ وہ تمام قید وبند توڑ کر اس دسترخوان سے متمتع ہونے لگا۔

یہی انسان کی غلطی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ نعمت سے تمتع اس وقت تک جائز ہی نہیں جب تک آدمی منعم کا اعتراف نہ کرے۔ منعم کے عطیّے کا اعتراف ہی وہ قیمت ہے جس کو ادا کرنے کے بعد انسان کو یہ حق ملتا ہے کہ وہ اس نعمت کو اپنے لیے استعمال کرے۔

نعمت اور منعم کو ایک دوسرے سے جدا کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک جرم ہے۔ اور یہ جرم انسان کی پوری زندگی کو برباد کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی تواضع کے بجائے سرکشی کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ وہ ڈسپلن کے بجائے لامحدود آزادی کو اپنا طریقہ بنالیتا ہے۔ وہ فرض شناس (duty conscious) کے بجائے حقوق شناس (right conscious) بن جاتا ہے۔ وہ جوابدہی (resposibility) کو چھوڑ کر انارکی کے راستے پر چل پڑتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ وہ خدا کو خدا بنانے کے بجائے اپنے آپ ہی کو خدا کے مقام پر بٹھا دیتا ہے۔ اس طرح وہ نظریہ وجود میں آتا ہے جس کو ہیومنزم کہا جاتا ہے۔ جس کا کلمہ یہ ہے:

Transfer of seat from God to man.

قدیم زمانے میں نیچر کے بارے میں انسان توہم پرستی میں مبتلا ہوا تھا۔ یہ بلاشبہہ ایک برائی تھی مگر وہ نسبتاً چھوٹی برائی تھی۔ موجودہ زمانے میں نیچر کے بارے میں جو نظریہ پیدا ہوا وہ اپنے نقصانات کے اعتبار سے پہلے سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ اس کا نقصان صرف یہ نہیں تھا کہ نئے زمانے میں پہلی عالمی جنگ اور دوسری عالمی جنگ جیسی تباہ کن لڑائیاں وجود میں آئیں، جو پچھلے دور میں کبھی وجود میں نہیں آئی تھیں۔ اس طرح نئے زمانے میں نیوکلیر بم جیسے مہلک ہتھیار بنائے گئے جس کا تصور بھی قدیم انسان نے نہیں کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید نظریے کے تحت پیدا ہونے والی

ایک اور برائی ہے جو دوسری تمام برائیوں سے زیادہ سنگین ہے، اور وہ ہے لامحدود آزادی یا بے قید آزادی کا تصور۔ قدیم زمانے کا انسان تو ہم پرستی کے باوجود اپنے آپ کو کچھ حدود و قیود کا پابند سمجھتا تھا، مگر موجودہ زمانے کے انسان نے اپنے آپ کو حدود و قیود کی پابندیوں سے آزاد سمجھ لیا۔ اس کے نتیجے میں استحصال اور اباحیت پر مبنی وہ تمدن پیدا ہوا جس نے انسانی زندگی کو حیوانی زندگی سے بھی زیادہ بدتر بنا دیا۔

کائنات میں انسان کا مقام

انسان اور انسان کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے اس کو مصلحین (reformers) اور مفکرین نے درست طور پر دریافت کیا۔ یہ تعلق مختصر طور پر یہ تھا— ہر انسان آزاد ہے، اس وقت تک جب تک کہ ایک انسان کی آزادی دوسرے انسان کی آزادی میں خلل ڈالنے والی نہ ہو۔ اس نظریے کو ایک کہانی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ امریکا جب یورپ کے سیاسی قبضے سے آزاد ہوا، اس وقت ایک امریکی شہری اپنے گھر سے باہر نکلا۔ وہ اپنی آزادی کا جشن منانا چاہتا تھا۔ وہ ایک سڑک پر اپنے دونوں ہاتھ ہلاتا ہوا بے فکری کے ساتھ چل رہا تھا۔ اِس اثنا میں اس کا ایک ہاتھ دوسرے مسافر کی ناک سے ٹکرا گیا۔ مسافر کو غصہ آ گیا۔ اس نے کہا کہ یہ کیا بیہودگی ہے۔ تم نے کیوں اپنے ہاتھ سے میری ناک پر مارا۔ امریکی شہری نے جواب دیا کہ آج امریکا آزاد ہے۔ اب میں آزاد ہوں کہ میں جو چاہوں کروں۔ مسافر نے کہا کہ میرے بھائی، تمہاری آزادی وہاں ختم ہوجاتی ہے جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے:

My brother, your freedom ends where my nose begins.

یہ قصہ انسان اور انسان کے درمیان تعلق کے اصول کو درست طور پر بیان کرتا ہے۔ مگر جہاں تک انسان اور خدا کے درمیان تعلق کی بات ہے اس کو انسان درست طور پر دریافت نہ کرسکا۔ اس طرح اس معاملے میں انسان کی دریافت صرف پچاس فیصد کے بقدر تھی۔

تاہم یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان تعلق کا اصول ہی یہ بتا رہا ہے کہ انسان اور خدا کے درمیان درست تعلق کا اصول کیا ہے۔ مذکورہ اصول کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ اس تعلق کا اصول مختصر طور پر یہ ہے— انسان کی آزادی اس حد پر ختم ہوجاتی ہے جہاں سے خدا کی حد شروع ہوتی ہے:

Man's freedom ends where God's domain begins.

اس دنیا میں انسان کو جو چیزیں ملی ہیں وہ سب کا سب خدا کا عطیہ ہیں۔ تمام چیزیں خدا کے دینے سے انسان کو ملی ہیں۔ ٹھیک یہی معاملہ آزادی کا بھی ہے۔ اس دنیا میں انسان کو جو آزادی ملی ہوئی ہے وہ مکمل طور پر خدا کا عطیہ ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہر عطیہ اپنے ساتھ ذمّے داری بھی لاتا ہے۔ اس عام اصول کے تحت، انسان کو ملی ہوئی آزادی بھی ایک لازمی ذمے داری کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ وہ ذمے داری یہ ہے کہ — انسان اپنی آزادی کا صرف صحیح استعمال کرے، وہ کبھی اس آزادی کا غلط استعمال نہ کرے۔

آزادی کا غلط استعمال یہ ہے کہ آدمی اِس آزادی کو اپنا حق سمجھ لے۔ وہ یہ یقین کرلے کہ میں اس آزادی کا مالک ہوں۔ میں جس طرح چاہوں اِس آزادی کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کروں۔ اپنی آزادی کو استعمال کرنے کے بارے میں مجھے کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

اس کے مقابلے میں آزادی کا صحیح استعمال یہ ہے کہ آدمی یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس کو جو آزادی حاصل ہے، وہ اس کو کسی کے دینے سے ملی ہے۔ اور پھر یہ معلوم کرے کہ جو آزادی کا دینے والا ہے اس کی منشا اس آزادی سے کیا ہے، اور اس کی منشا کے مطابق، مجھے اپنی آزادی کو کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔ یہی وہ دریافت ہے جو کسی آدمی کے لیے اپنی آزادی کو استعمال کرنے کا جواز فراہم کرتی ہے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ آزادی کا صحیح استعمال اور غلط استعمال کوئی پُر اسرار چیز نہیں۔ کوئی بھی شخص اگر سنجیدہ ہے تو وہ یقینی طور پر اس کو دریافت کرسکتا ہے۔ کسی بھی حقیقت کو دریافت کرنے کے لیے سنجیدگی ضروری ہے۔ اس طرح آزادی کے اِس قانون کو دریافت کرنے کے لیے بھی سنجیدگی لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔

جو آدمی اِس سوال پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے تو وہ سب سے پہلے اس دریافت تک پہنچے گا کہ ہر عورت اور مرد کے اندر پیدائشی طور پر صحیح اور غلط کی ایک کسوٹی رکھی ہوئی ہے۔ ہر آدمی خود اپنے فطری شعور کے تحت یہ جان سکتا ہے کہ کون سا رویّہ صحیح ہے اور کون سا رویّہ غلط۔ فطرت کی یہ کسوٹی وہی ہے جس

کو ضمیر (conscience) کہا جاتا ہے۔ اسی کا دوسرا نام کامن سنس (common sence) بھی ہے۔

اس طرح آدمی خود اپنی فطرت کی آواز کے تحت، یہ جان سکتا ہے کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ ہر آدمی کی فطرت گویا اس کے لیے ایک گائڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر آدمی کے اندر ایک متنبّہ کرنے والا عنصر (warner) موجود ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ یہ عنصر کبھی غافل نہیں ہوتا۔ وہ کبھی اپنی ڈیوٹی کی بجا آوری میں کوتاہی نہیں کرتا۔

اس سلسلے میں پہلی بات جو فطرت کے اس نظام کے تحت معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ انسان کے اندر پیدائشی طور پر ایک طاقت ور جذبہ موجود ہے۔ یہ اعتراف (acknowlegement) کا جذبہ ہے۔ ہر عورت اور مرد ذاتی طور پر اس کا تجربہ کرتے ہیں۔ ہر آدمی اپنے ضمیر یا کامن سنس کے ذریعے یہ جانتا ہے کہ جب بھی ایک شخص دوسرے شخص کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کرے تو دوسرے شخص کو چاہیے کہ وہ بھرپور طور پر اس کا اعتراف کرے۔ انسان کا داخلی گائڈ اعتراف کو ایک اعلیٰ اخلاقی قدر سمجھتا ہے۔ انسانی فطرت کے مطابق، اعتراف مسلّمہ طور پر شرافت کا اعلیٰ وصف ہے۔ اور بے اعترافی پستی اور ذلت کی پہچان ہے۔ اعتراف کرنے والا اپنی حیثیتِ انسانی کو برقرار رہتا ہے، اور اعتراف نہ کرنے والا اپنے آپ کو انسانی درجے سے نیچے گرالیتا ہے۔

ضمیر یا کامن سنس کا یہ فیصلہ خالق کے معاملے میں بھی یکساں طور پر درست ہے۔ ہر انسان کو چاہیے کہ وہ خود اپنی فطرت کی آواز کے تحت اپنے خالق کا اعتراف کرے۔ وہ اپنے خالق کے احسانات کو مانے۔ اس کے خالق نے اس کو جو نعمتیں عطا کی ہیں، ان کو اپنے دل کی گہرائی کے ساتھ محسوس کرے اور زبان سے کھلے طور پر اس کا اعلان کرے۔ خالق کا اعتراف فطرتِ انسانی کے مطابق ہے، اور خالق کا عدم اعتراف فطرتِ انسانی سے انحراف کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی طرح ہر عورت اور مرد کا تجربہ ہے کہ اس کا ضمیر ایک اخلاقی کسوٹی ہے۔ جو ہر موقعے پر اس کو آگاہ کرتا رہتا ہے۔ یہ ضمیر جھوٹ بولنے پر اس کو ملامت کرتا ہے اور سچ بولنے پر اس کے لیے اطمینان کا باعث بنتا ہے۔ یہ ضمیر ناانصافی کو بُرا سمجھتا ہے، اور انصاف کو ہمیشہ اچھا بتاتا ہے۔ یہ ضمیر بددیانتی

(dishonesty) پر اپنی بے زاری ظاہر کرتا ہے اور دیانت داری پر اپنے اطمینان کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ضمیر تشدد کو غیر انسانی چیز سمجھتا ہے اور امن کو ایک اعلیٰ انسانی اصول کا درجہ دیتا ہے۔ یہ ضمیر نفرت کو پست کرداری کی حیثیت دیتا ہے، اور محبت کو اعلیٰ انسانی قدر کا درجہ عطا کرتا ہے۔ یہ ضمیر غصّے کو رد کر دیتا ہے، اور معافی پر اپنی پسندیدگی کا سرٹفکٹ عطا کرتا ہے، وغیرہ۔

اسی طرح انسان جب اپنے باہر کی دنیا کو دیکھتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ اس کے علاوہ تمام مخلوقات سختی کے ساتھ اپنے خالق کے قانون میں بندھی ہوئی ہے۔ زمین سے لے کر وسیع خلا تک، ہر چیز انتہائی ڈسپلن کے ساتھ اپنے مُفوّضہ عمل کو انجام دیتی ہے۔ کوئی چیز، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، اِس ڈسپلن سے انحراف نہیں کرتی۔ زمین کے جمادات، نباتات اور حیوانات سے لے کر خلا کے ستاروں اور سیّاروں تک ہر چیز مکمل طور پر اِس آفاقی ڈسپلن میں بندھی ہوئی ہے۔

یہ ڈسپلن خالق کا قائم کیا ہوا ہے۔ یہی ڈسپلن انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کو بقیہ کائنات کی طرح اس کائناتی ڈسپلن کا حصہ بن جانا ہے، صرف اِس فرق کے ساتھ کہ کائنات کی بقیہ چیزیں مجبورانہ طور پر اِس عالمی ڈسپلن میں بندھی ہوئی ہیں جب کہ انسان کو اختیارانہ طور پر اپنے آپ کو اس ڈسپلن میں شامل کر لینا ہے۔

مثلاً شمسی نظام کے تمام سیارے (planets) سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اسی طرح انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ خالق کو اپنا مرکز ومحور بنا کر اس کے گرد اپنی زندگی کی تشکیل کرے۔ اِس دنیا کی کوئی بھی چیز ٹھہری ہوئی نہیں ہے، بلکہ یہاں کی چیز مسلسل طور پر حرکت میں ہے۔ پوری کائنات ایک عظیم کارخانے کی مانند حرکت وعمل میں مصروف ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں نہ شور ہے اور نہ دھواں۔ یہاں کسی بھی قسم کی کوئی کثافت نظر نہیں آتی۔ اسی طرح انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی سرگرمیوں کا نقشہ اس طرح بنائے کہ اس کی سرگرمیاں کسی بھی قسم کی کثافت (pollution) کا سبب نہ بنیں۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز نفع رسانی کے اصول پر قائم ہے۔ روشن سورج سے لے کر بہتے ہوئے دریا تک، اور سرسبز درختوں سے لے کر ہواؤں کے جھونکوں تک، اور پہاڑوں سے لے کر کیڑے مکوڑوں

تک، ہر چیز کوئی مفید عمل انجام دے رہی ہے۔ اس وسیع کائنات کا ہر جُز یک طرفہ طور پر دینے والا ہے نہ کہ لینے والا۔ اسی طرح انسان کو چاہیے کہ وہ اس دنیا میں اپنی زندگی کا نقشہ اس طرح بنائے کہ وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بن جائے۔ ہر انسان سے دوسرے انسان کو فائدہ پہنچ رہا ہو۔

اسی طرح مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان ہمیشہ انجام کو سوچ کر اپنے عمل کا نقشہ بناتا ہے۔ انسان کی سوچ ایک نتیجہ رُخی (result-oriented) سوچ ہے۔ انسان اسی عمل کو پسند کرتا ہے جس کا کوئی مثبت نتیجہ نکلے۔ انسان کی فطرت اِس سے اِبا کرتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو۔

اِس انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان وسیع تر معنوں میں اِس اصول کے مطابق اپنی زندگی کا نقشہ بنائے۔ جس طرح وہ موت سے پہلے کے عرصۂ حیات میں اپنے عمل کی منصوبہ بندی نتیجے کو سامنے رکھ کر کرتا ہے، اسی طرح وہ موت کے بعد کے عرصۂ حیات کے لیے بھی نتیجے کو معیار بنائے۔ وہ قبل از موت اپنی زندگی کی سرگرمیوں کو اس طرح منظّم کرے جو بعد از موت عرصۂ حیات میں اس کے لیے مفید ثابت ہونے والا ہو۔

جیسا کہ معلوم ہے، ہماری دنیا کا نظام آج اور کل یا حال اور مستقبل میں بَٹا ہوا ہے۔ مگر انسان کے سوا اِس دنیا میں جو مخلوقات ہیں وہ سب کی سب آج میں عمل کرتی ہیں۔ آج یا حال کے سوا ان کے اندر زندگی کا کوئی تصور نہیں۔ کل (tomorrow) کا لفظ صرف انسان کی ڈکشنری میں پایا جاتا ہے۔ دوسری مخلوقات کی ڈکشنری کل کے لفظ سے خالی ہے۔

یہ فرق گویا فطرت کا ایک اشارہ ہے۔ اس فرق کی صورت میں فطرت انسان کو بتا رہی ہے کہ تم صرف آج (today) پر قناعت نہ کرو بلکہ تمہیں کل (tomorrow) کو سامنے رکھ کر اپنی سرگرمیوں کا نقشہ بنانا ہے۔ دوسری مخلوقات کی کامیابی صرف یہ ہے کہ وہ اپنے آج کو پالیں۔ مگر انسان کی کامیابی یہ ہے وہ آج کے بعد اپنے کل میں بھی کامیاب رہے۔ وہ موت کے بعد آنے والی ابدی دنیا میں اپنے لیے بہتر مقام حاصل کرلے۔

حقیقت کی دریافت

Discovering the Truth

انسان ایک متلاشیِ حق حیوان ہے(Man is a truth-seeking animal)۔ میں نے خود اپنی ذات میں اس کا تجربہ کیا ہے۔ میرے اندر بچپن سے سچائی کی تلاش کا جذبہ کسی نہ کسی طرح موجود تھا۔ ۱۹۴۲ میں یہ جذبہ پوری شدت کے ساتھ ابھر آیا۔ اُس زمانے میں میرا حال یہ تھا کہ میں جنگلوں اور ویرانوں میں چلا جاتا اور تنہائی میں رو رو کر یہ کہتا کہ: ''خداوند، تو کب آئے گا۔ میں کب تک تیرے آنے کا انتظار کروں''۔

آخر کار ایک خدائی کلام میں مجھے اس کا جواب ملا۔ اس کے مطابق، خدا نے فرمایا ہے: **کنتُ کنزاً مخفیّا فاردتُ ان اُعرف فخلقت الخلق** (میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، پھر میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں۔ پھر میں نے انسان کو پیدا کیا)۔ اس ارشاد کے مطابق انسان کا مقصد وجود یہ ہے وہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کرے۔ اور اس معرفت کی قیمت میں وہ ابدی جنت میں جگہ پائے۔ موت کے پہلے کا دور حیات حصول معرفت کا دَور ہے اور موت کے بعد کا دَور حیات آرام اور راحت کی ابدی جنت کی دنیا میں زندگی گذارنے کا دَور۔

یہ معرفتِ رب کوئی سادہ چیز نہیں۔ یہ ایک مشکل ترین مہم ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ابتدائی دَور حیات میں انسان کے رہنے کے لیے خدا نے جو دنیا بنائی وہ مکمل طور پر شبہات سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے ہر جُز میں ایک شبہہ کا عنصر (element of doubt) پایا جاتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی فکری یا عملی چیز ایسی نہیں جو شبہہ سے خالی ہو۔ موت سے پہلے کے اِس دَورِ حیات میں انسان کا کام یہ ہے کہ وہ شبہات کے پردے کو پھاڑ کر حقیقت کو دیکھے، وہ شبہات کے باوجود کامل یقین کا درجہ حاصل کرے۔

دنیا میں جتنی بھی چیزیں ہیں ان سب پر شبہات کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ انسان پیدا ہوتے ہی اپنے

آپ کو اَفکار کے ایک جنگل میں پاتا ہے۔ زندگی کے بارے میں مختلف قسم کے فلسفے اس کو حیرانی کا تحفہ دیتے ہیں۔ یہاں درجنوں مذاہب ہیں اور ہر مذہب اپنے بارے میں سچا ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ ہر انسان اپنے اندر جذبات وخواہشات کا ایک طوفان لیے ہوئے ہے جو خالص عقلی رویّہ اختیار کرنے میں مسلسل رکاوٹ بنتا ہے۔ اسی طرح ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ خاندانی اور سماجی بندھن میں پھنسا ہوا ہے۔ ہر آدمی مفادات کے خول میں جی رہا ہے۔ ہر آدمی کی عادتیں اور رجحانات اس کو اپنے ساتھ باندھے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی مال واولاد، اور رشتے داروں کے جال میں اس طرح پھنسا ہوا ہے کہ اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

ایسی حالت میں سچائی کی معرفت صرف اُس انسان کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے اندر موضوعی طرزِ فکر (objective thinking) کی تشکیل کر سکے۔ وہ اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کر سکے کہ وہ شبہات کے پردے کو پھاڑ کر حق کو حق کے روپ میں دیکھے اور باطل کو باطل کے روپ میں دیکھے۔ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھے جیسا کہ وہ ہیں۔

اسی کے ساتھ اس کے اندر وہ صلاحیت ہو جس کو انقلابی صلاحیت (revolutionary nature) کہا جاتا ہے۔ یعنی جب ایک بات سمجھ میں آجائے تو کسی بھی مصلحت کی پَروا کیے بغیر وہ کھُلے طور پر اس کو قبول کر لے۔ وہ اپنی زندگی کا رُخ بدل کر دریافت شدہ حقیقت کو اپنی زندگی کا نشانہ بنالے۔

شبہات کے اِس پَردے کو پھاڑنے کا ذریعہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے خالق کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کو جاننا۔ یہ تخلیقی منصوبہ چیزوں کی اس طرح توجیہہ کر دیتا ہے کہ شبہات کے تمام پردے ہٹ جاتے ہیں اور حقیقت اسی طرح نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے جس طرح کالے بادل چھٹنے کے بعد روشن سورج سامنے آجاتا ہے۔

خدا کا تخلیقی منصوبہ کیا ہے۔ اِس تخلیقی منصوبے کا کلیدی پہلو یہ ہے کہ انسان کو ہر قسم کی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اور پھر اس کو مکمل طور پر آزاد کر دیا گیا ہے۔ اب انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنی آزادی کو صرف صحیح طور پر استعمال کرے، وہ اپنی آزادی کا کبھی غلط استعمال (misuse) نہ کرے۔

اِسی استعمال کے اوپر انسان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ آزادی کا صحیح استعمال کرنے والوں کے لیے جنت ہے اور آزادی کا غلط استعمال کرنے والوں کے لیے جہنم۔ اِس آزادی کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس سے مسابقت اور چیلنج پیدا ہوتا ہے اور مسابقت اور چیلنج کے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں۔

فلسفے میں انسان اور خدا کی نسبت سے سب سے زیادہ قابلِ بحث سوال وہ رہا ہے جس کو بُرائی کا مسئلہ (problem of evil) کہا جاتا ہے۔ یعنی انسانی دنیا میں اتنی زیادہ مصیبت (suffering) کیوں ہے۔ خدا اگر مکمل خوبی ہے تو اس نے ایسی دنیا کیوں بنائی جہاں انسان طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنے پر مجبور ہے۔

خدا کے تخلیقی نقشے کو سمجھنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ یہ تمام مصیبتیں کسی نہ کسی پہلو سے آزادی کے غلط استعمال کی قیمت ہیں۔ یہ قیمت بظاہر ایک بہت سخت قیمت ہے لیکن خدا کی طرف سے یہ خوش خبری ہے کہ موت کے بعد جب یوم الحساب (Day of Judgement) آئے گا تو خدا کسی انسان کو اس کے صرف اُس عمل پر پکڑے گا جس میں یہ ثابت ہو کہ آدمی نے اپنی ملی ہوئی آزادی کا استعمال کیا تھا۔ اس کے سوا خالق کے تخلیقی نقشے کی بنا پر کسی کو جو مصیبت پیش آئے گی اُس کے لیے ایسی تلافی (compensation) کا انتظام کردیا جائے گا کہ وہ بلا اشتباہ یہ سمجھ لے گا کہ اس کے ساتھ جو ہوا وہ عین انصاف کا تقاضا تھا۔ مزید یہ کہ یہ مصیبت ایک اعتبار سے شاک ٹریٹمنٹ ہے (Shock treatment) ہے۔ کیوں کہ وہ انسان کے لیے ذہنی ارتقاء کا ذریعہ بنتی ہے۔

سفرنگ کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے یہ طریقہ کافی نہیں ہے کہ اپنے ذہنی قیاس کے تحت اس پر رائے قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس کو تاریخ انسانی کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کی ترقی کے لیے زیادہ بڑا عامل آرام نہیں ہے بلکہ مصیبت ہے۔ آرام میں انسان کی صلاحیتیں مفلوج ہوکر رہ جاتی ہیں۔ اس کے برعکس، مصیبتوں میں جو انسان بنتے ہیں وہ زیادہ بڑی بڑی ترقیاں حاصل کرتے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

It is not ease but effort, not facility but difficulty that makes men.

مغرب کے ترقی یافتہ سماجوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہاں ایک نئی ''بیماری'' پیدا ہوئی ہے جس کو افلوئنزا (affluenza) کا نام دیا گیا ہے۔ یہ خوش حال طبقے کی بیماری ہے۔ خوش حال گھرانوں میں ذہنی سورماؤں کے بجائے ذہنی بونے (intellectual dwarf) بن رہے ہیں۔ ان کا آئی کیو (IQ) بہت کم ہوتا ہے۔ وہ کاہل ہوتے ہیں اور کام میں حصہ نہیں لے پاتے۔ آج بھی اور پچھلی تاریخ میں ایسا ہوا ہے کہ مصیبتوں میں پلنے والے لوگوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں، انڈیا میں تقریباً تمام بڑے لیڈروں نے مشکل حالات میں پرورش پائی۔ اسی طرح جتنے بڑے بڑے دولت مند لوگ ہیں وہ سب غریب گھرانوں میں پیدا ہوئے اور پھر محنت کرکے ترقی حاصل کی۔

انسانی تاریخ کے ہر دور میں ایسے مفکر پیدا ہوتے رہے جنھوں نے یہ کوشش کی کہ وہ آئیڈیل انسانی سماج بنائیں یا آئیڈیل ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔ ہر ایک اپنی تمام کوششوں کے باوجود صرف ایک غیر معیاری سماج بنا سکا۔

تاریخ کا یہ ظاہرہ بھی خالق کے تخلیقی منصوبے کو سامنے رکھنے سے پوری طرح سمجھ میں آجاتا ہے۔ خالق نے موجودہ دنیا اِس لیے نہیں بنائی کہ یہاں آئیڈیل سماج یا آئیڈیل ریاست قائم ہو۔ موجودہ دنیا کی محدودیت اور اس کے اندر مختلف قسم کے ڈس ایڈوانٹیج (disadwantage) کا ہونا حتمی طور پر اِس امر میں مانع ہے کہ یہاں کوئی آئیڈیل سماج یا آئیڈیل ریاست قائم ہوسکے۔

مذہب اور انسانی زندگی

مذہب کیا ہے۔ مذہب کا خلاصہ وہی چیز ہے جس کو عام زبان میں اسپریچولٹی کہا جاتا ہے۔ مذہب دراصل اسپریچول سائنس کا دوسرا نام ہے۔ دوسرے علوم اگر خارجی علوم ہیں تو مذہب وہ علم ہے جو داخلی انسان کا مطالعہ کرتا ہے۔

انسان بیک وقت دوقسم کی شخصیت رکھتا ہے— جسم اور روح۔ دونوں ہی کی صحت اور ترقی کے لیے مسلسل غذا کی ضرورت ہے۔ جسم کی غذا وہ ماڈی چیزیں ہیں جن کو کھانا اور پانی کہا جاتا ہے۔ کوئی آدمی اگر اس طرح رہے کہ اس کو دیر تک کھانا اور پانی نہ ملے تو وہ جسمانی صحت کھودے گا۔ یہاں تک کہ اگر زیادہ دیر تک اس کو ماڈی فاقہ پیش آئے تو وہ مرکر ختم ہوجائے گا۔

یہی معاملہ مذہب کا بھی ہے۔ مذہب انسان کی روحانی غذا ہے۔ مذہب انسان کی داخلی شخصیت کو تقویت دیتا ہے۔ مذہب انسان کی روحانی حیات کا ضامن ہے۔ مذہب نہ گانے بجانے کی دھوم کا نام ہے اور نہ کسی قسم کے rituals کا نام۔

مذہب دراصل سچائی کا نمائندہ ہے۔ سچائی مذہب ہے اور مذہب سچائی۔ مذہب کی ضرورت ہر شخص کو ہے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، طاقتور ہو یا بے طاقت۔ مذہب کے ذریعے آدمی کو زندگی کا نقطۂ آغاز ملتا ہے۔ جو آدمی مذہب سے محروم رہے وہ زندگی کے نقطۂ آغاز کو پانے سے بھی محروم رہے گا۔

مذہب اس سوال کا جواب ہے کہ میں کون ہوں (Who am I)۔ مذہب انسان کو تخلیق کا راز بتاتا ہے۔ مذہب آدمی کو زندگی کا صحیح فلسفۂ حیات دیتا ہے۔ مذہب زندگی کے لیے گائڈ بک کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذہب آدمی کو بے خبری کے اندھیرے سے نکال کر واقفیت کی روشنی میں لاتا ہے۔

مذہب آدمی کو سماج کا اچھا شہری بناتا ہے۔ مذہب آدمی کو وہ اخلاقی کوڈ عطا کرتا ہے جس کے مطابق وہ لوگوں کے درمیان سچا انسان بن کر رہے۔ مذہب آدمی کو تیار کرتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے پرابلم نہ بنے۔ مذہب آدمی کو دینے والا بناتا ہے، نہ کہ صرف لینے والا۔

مذہب مشکل وقت میں انسان کا ساتھی ہے۔ مذہب آدمی کو وہ چیز دیتا ہے جس کو art of crisis management کہا جاتا ہے۔ مذہب آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ کرائسس کا شکار نہ ہو بلکہ کرائسس کو اپنے لیے ایک فکری غذا بنا لے۔

مذہب کسی انسان کے لیے انٹیلکچول ہیلتھ کی علامت ہے۔ مذہب آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ نگیٹیو تجربات کو پازیٹیو رزلٹ میں کنورٹ کر سکے۔ وہ اپنے نہیں کو ہے میں تبدیل کر لے۔ مذہب آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ کانٹے کو پھول کے روپ میں دیکھے۔ وہ اپنے دشمن کو اپنا دوست بنا لے۔

مذہب معروف معنوں میں کسی set of rituals کا نام نہیں۔ مذہب یہ بھی نہیں ہے کہ آدمی کسی فیملی میں پیدا ہو جائے یا وہ کسی گروپ سے وابستہ ہو جائے۔ یہ سب ظاہری چیزیں ہیں۔ یہ مذہب کی اصل حقیقت نہیں۔ مذہب کی اصل حقیقت داخلی معرفت ہے، اور داخلی معرفت ہر ظاہری چیز سے اوپر ہوتی ہے۔

مذہب آدمی کے اندر رائٹ تھنکنگ بیدار کرتا ہے۔ مذہب آدمی کو وہ چھپی ہوئی چیزیں دکھا دیتا ہے جس کو عام انسانی آنکھ نہیں دیکھتی۔ مذہب آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ پاسٹ سے سبق لے اور پریزینٹ میں فیوچر کو دیکھ سکے۔ مذہب مَین کو سپر مین بناتا ہے۔ مذہب انسانی ارتقاء کا ذریعہ ہے۔

ہماری دنیا کے دو پہلو ہیں۔ ایک دکھائی دینے والی دنیا اور دوسری نہ دکھائی دینے والی دنیا۔ دنیا کا معاملہ آئس برگ جیسا ہے۔ اُس کا ایک چھوٹا سا ٹپ(tip) آدمی کو دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس کا زیادہ بڑا حصہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہوتا۔ مذہب آدمی کے لیے نہ دکھائی دینے والی چیز کو دکھائی دینے والی چیز بناتا ہے۔ مذہب آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اس آئس برگ کے چھپے ہوئے زیادہ بڑے حصے کو دیکھ لے۔ وہ سمندر کی سطح سے گذر کر سمندر کی گہرائی تک پہنچ جائے۔

زندگی میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ انسان اپنے کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ جب آدمی کو یہ اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ اسباب کا سرا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ اُس وقت مذہب اُس کے لیے نجات دہندہ بن کر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اُس وقت مذہب اُس کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچا لیتا

ہے۔اُس وقت مذہب اُس کے لیے یقین واعتماد کا سرچشمہ ثابت ہوتا ہے۔

مذہب تمام پازیٹیو اخلاقیات کا سرچشمہ ہے۔مذہب آدمی کو یہ طاقت دیتا ہے کہ وہ غصہ دلانے والے کو معاف کردے۔وہ لالچ سے اُوپر اُٹھ جائے۔وہ حسد کے جذبے کو اپنے اندر کچل دے۔وہ لوگوں کے ساتھ ٹالرنس کا معاملہ کرے۔وہ ہر ایک کے ساتھ یکساں طور پر عزت کا معاملہ کرے۔وہ اپنے آپ کو بے انصافی سے بچائے اور ہمیشہ انصاف پر قائم رہے۔وہ اپنے دشمن سے بھی اچھا سلوک کرے۔وہ اپنے سماج میں دینے والا بن کر رہے نہ کہ صرف لینے والا۔

مذہب آدمی کو بامقصد انسان بناتا ہے۔وہ آدمی کے اندر بااصول کیریکٹر پیدا کرتا ہے۔مذہب آدمی کے اندر سِلف کنٹرول اور سلف ڈسپلن کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔سچا مذہبی انسان اپنے نیچر کے اعتبار سے ایک قابلِ پیشین گوئی (predictable) انسان ہوتا ہے۔سچے مذہبی انسان کے بارے میں کوئی شخص پیشگی طور پر یہ جان سکتا ہے کہ وہ کس صورتِ حال میں کس قسم کا رویہ پیش کرے گا۔

مذہبی انسان ایک سنجیدہ انسان ہوتا ہے۔مذہبی انسان ایک آنسٹ انسان ہوتا ہے۔ مذہبی انسان وہ انسان ہوتا ہے جو ہمیشہ اپنا احتساب کرتا رہے۔مذہبی انسان اپنے اندر ایک (self corrctive mechanism) رکھتا ہے۔مذہبی انسان کی یہ صفت اس کو ہمیشہ نیا انسان بناتی رہتی ہے۔

مذہب کسی انسان کے اندر یہ اعلیٰ صفات کیوں کر پیدا کرتا ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ مذہب کا سرا خدا سے جُڑا رہتا ہے اور خدا تمام اعلیٰ صفات کا مجموعہ ہے۔خدا ہر انسان کے لیے سورس آف انسپریشن (source of inspiration) کی حیثیت رکھتا ہے۔

مذہب کسی انسان کو گاڈ اورینٹیڈ انسان بناتا ہے۔مذہب انسان کے اندر گاڈ اورینٹڈ تھنکنگ پیدا کرتا ہے۔مذہبی انسان کی سوچ گاڈ اورینٹیڈ (God oriented thinking) ہوتی ہے۔یہی وہ چیز ہے جو کسی مذہبی انسان کو ناقابلِ تسخیر انسان بنا دیتی ہے۔مذہبی انسان کو خدا کی نسبت حاصل ہوجاتی ہے اور جس انسان کو خدا کی نسبت حاصل ہوجائے وہ سورج اور چاند اور پہاڑوں اور

سمندروں سے بھی زیادہ طاقتور انسان بن جائے گا۔

یہاں ایک واقعہ نقل کرنا مناسب ہوگا جو تمثیل کی زبان میں بتاتا ہے کہ ایک سچّا مذہبی انسان کس طرح ایک ناقابلِ تسخیر انسان ہوتا ہے۔ سچّا مذہبی انسان وہ انسان ہوتا ہے کہ سمندر کا طوفان بھی اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ بنے۔

کہا جاتا ہے کہ امریکا کے ساحل سے ایک سمندری جہاز افریقہ کے لیے روانہ ہوا۔ اٹلانٹک سمندر میں وہ اپنا سفر طے کر رہا تھا کہ اچانک سخت طوفان آ گیا۔ جہاز ہچکولے کھانے لگا۔ جہاز کے تمام مسافر گھبرا اُٹھے۔ تمام لوگ پریشانی کے عالم میں ادھر اُدھر دوڑنے لگے۔ جہاز سمندر کی سطح پر تنکے کی طرح الٹ پلٹ ہو رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب بس وہ جلد ہی ڈوبنے والا ہے۔

اضطراب کے اس عالم میں ایک مسافر جہاز کے اندر ادھر اُدھر چل رہا تھا۔ اچانک اُس نے دیکھا کہ ایک گوشے میں ایک بچی اطمینان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے اور اپنی گڑیا کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ مسافر نے اس بچی سے کہا کہ کیا تم کو خبر ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ بچی نے معصومیت کے ساتھ پوچھا کیا ہے۔ مسافر نے جواب دیا کہ ہمارا جہاز شدید طوفان میں گھر گیا ہے اور وہ جلد ہی ڈوبنے والا ہے۔ بچی نے اپنی گڑیا میں مشغول رہتے ہوئے کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا:

You know, my father is captain of this
ship. He is not going to let it sink.

بچی کا یہ واقعہ ایک سچے مذہبی انسان کی تصویر ہے۔ مذہبی انسان کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ کرائسس کے ٹائم میں بھی اپنے حواس کو برقرار رکھتا ہے۔ وہ کبھی حوصلہ نہیں کھوتا۔ وہ ہمیشہ امید میں جیتا ہے۔ وہ ہر صورتِ حال میں یہ کہنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے کہ:

God Almighty is the captain of my
ship. He is not going to let it sink.

باب دوم

خدا کا کریشن پلان

ایک مغربی فلسفی نے لکھا ہے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان اس وسیع کائنات میں ایک اجنبی مخلوق ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نہ انسان اِس دنیا کے لیے بنایا گیا اور نہ دنیا اِس انسان کے لیے۔ انسان اور کائنات دونوں ایک دوسرے کے لیے بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں۔

انسان لامحدود صلاحیتوں کو لے کر پیدا ہوا ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں وہ اپنی ان صلاحیتوں کا صرف محدود استعمال پاتا ہے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ہمیشہ جینا چاہتا ہے مگر بہت جلد موت اُس سے پوچھے بغیر آتی ہے اور یکطرفہ فیصلے کے تحت اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ انسان خواہشوں (desires) کا ایک سمندر اپنے سینے میں لیے ہوئے ہے، مگر اس کی یہ خواہشیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ ہر آدمی کے دماغ میں خوابوں کی ایک دنیا بَسی ہوئی ہے، مگر یہ خواب کبھی اپنی تعبیر نہیں پاتے۔ اس معاملے میں چھوٹے انسان اور بڑے انسان میں کوئی فرق نہیں۔ مذکورہ فلسفی کے الفاظ میں، بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہے جو اس کے لیے بنائی نہیں گئی۔

انسان اور موجودہ دنیا دونوں ایک دوسرے کے لیے اس طرح غیر مطابق کیوں ہیں۔ اس سوال کا جواب پانے کے لیے ہم کو خدا کے کریشن پلان (creation plan) کو جاننا ہوگا۔ یہ سوال دراصل خدا کے کریشن پلان کو نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اور خدا کے کریشن پلان کو جان کر ہی اس سوال کا تشفی بخش جواب معلوم ہوسکتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اپنے ایک منصوبے کے تحت پیدا کیا ہے۔ اس منصوبے کو جاننا انسان کی درست توجیہہ کے لیے ضروری ہے۔ جس طرح کسی مشین کی معنویت صرف اُس وقت معلوم ہوتی ہے جب کہ اس کے بنانے والے انجینیئر کا منصوبہ معلوم ہو جائے۔ انجینیئر کے ذہن کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں جو مشین کی معنویت کو واضح کر سکے۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔

انسان کو بنانے والے نے اس کو ایک خاص منصوبے کے تحت بنایا۔ وہ منصوبہ یہ ہے کہ موجودہ

غیر معیاری دنیا میں آدمی ایک آزمائشی مدّت گذارے، اور اس کے بعد وہ اپنے عمل کے مطابق معیاری دنیا میں رہائش کا حق پا سکے، جس کا دوسرا نام جنت ہے۔

موجودہ دنیا ایک آزمائشی دنیا ہے۔ یہاں کسی عورت یا مَرد کو جنت کا مستحق بننے کے لیے جس اہلیت کا ثبوت دینا ہے، اس کے دو بڑے اَجزاء ہیں—— حق کا اعتراف اور با اُصول زندگی۔ جو عورت یا مرد اس جانچ میں پورے اُتریں اُن کو جنت کی معیاری دنیا میں جگہ ملے گی۔ اور جو لوگ اس جانچ میں فیل ہو جائیں وہ ابدی طور پر محرومی کی زندگی گذاریں گے۔

موجودہ دنیا میں آدمی اپنے آپ کو پوری طرح آزاد پاتا ہے، مگر یہ آزادی بطورِ حق نہیں بلکہ وہ ہر ایک کے لیے آزمائش کا ایک پَرچہ ہے۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ کسی دباؤ کے بغیر سچائی کا اعتراف کرے۔ وہ کسی جَبر کے بغیر حق کے آگے جھُک جائے۔ وہ اپنی آزادی کو خود اپنے اختیار سے پابندی بنا لے۔ حق کے آگے جُھکنا بلاشبہہ کسی انسان کے لیے سب سے بڑی قربانی ہے۔ حق کا اعتراف کرنا بظاہر اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلے میں چھوٹا کرنا ہے، مگر یہی وہ چیز ہے جو آدمی کو سب سے زیادہ اونچا درجہ دینے والی ہے۔ وہ آدمی کو جنّت کے دروازے تک پہنچانے والی ہے۔

اس سلسلے میں دوسری چیز بااصول زندگی ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا کردار اُس کے جذبات کے تحت بنتا ہے۔ غصہ، انتقام، حسد، نفرت اور مفاد پرستی وغیرہ۔ یہ وہ منفی احساسات ہیں جو کسی آدمی کی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ مگر آدمی کو چاہیے کہ وہ اس معاملے میں با اُصول بنے۔ وہ خارجی محرکات کے تحت اپنا کیریکٹر نہ بنائے بلکہ اصول کے تحت اپنے کردار کا تعیّن کرے۔ وہ خود اپنے فیصلے کے تحت اپنی شخصیت کی تشکیل اعلیٰ اصولوں کی روشنی میں کرے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو جنتی کردار کہا جاتا ہے۔

تخلیق کا یہی منصوبہ ہے جس کے تحت انسان کو بنایا گیا ہے۔ انسان پوری کائنات کی سب سے اعلیٰ مخلوق ہے۔ انسان کا وجود ایک ایسا انوکھا وجود ہے جس کی کوئی دوسری مثال وسیع کائنات میں نہیں ملتی۔ انسان کو بجا طور پر اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔ یعنی تمام پیدا کی ہوئی

چیزوں میں سب سے زیادہ بہتر اور بامعنی وجود۔

جنت وہ دنیا ہے جہاں انسان جیسی مخلوق اپنی کامل تسکین پاسکے۔ جہاں انسان اُس طرح سوچے جس طرح وہ سوچنا چاہتا ہے۔ جہاں وہ اُن چیزوں کو دیکھے جن کو دیکھنا اُسے مرغوب ہے۔ جہاں وہ اُن آوازوں کو سُنے جو حقیقی معنوں میں اُس کو لذتِ سماعت عطا کرنے والی ہوں۔ جہاں وہ اُن چیزوں کو چھوئے جن کو چھونا اُس کو اعلیٰ درجے کی لذّتِ لمس عطا کرتا ہے۔ جہاں اُس کو ایسے لوگوں کی صحبت مِلے جن کی صحبت میں رہنا اُس کی زندگی کو آخری حد تک بامعنی بنانے والا ہے۔ جہاں کی ہوائیں اُس کے لیے حیات بخش جھونکے کی حیثیت رکھتی ہوں۔ جہاں وہ اُن چیزوں کو کھائے جن کو اُس کا ابدی ذَوق کھانا چاہتا ہے، اور اُن چیزوں کو پیے جن کو پینا آج اُس کے لیے صرف ایک حَسین تصور بناہُوا ہے۔

اس معیاری دنیا کا نام جنت ہے۔ یہی وہ جنت ہے جس کی تمنا ہر عورت اور مَرد کے دل میں بسی ہوئی ہے۔ یہی وہ جنت ہے جہاں انسان کی شخصیت پورے معنوں میں فل فِل مینٹ (fulfilment) حاصل ہوگا۔ انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ اسی جنت کا طالب ہے۔ اور جنت اپنے پورے وجود کے ساتھ ایسے ہی انسان کا انتظار کررہی ہے۔ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ جنت اور انسان ایک دوسرے سے ملیں اور دونوں ایک دوسرے کو اپنا لیں جیسے کہ دونوں نے اپنے اُس جوڑے کو پالیا جو اُن کے لیے بنایا گیا تھا۔

مثبت شخصیت کی تعمیر

روسو (Jean Jacques Rousseau) فرانس کا مشہور جمہوری مفکر ہے۔ وہ ۱۷۱۲ میں پیدا ہوا اور ۱۷۷۸ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ شخصی بادشاہت کے مقابلے میں عوامی حکمرانی کا علم بردار تھا۔ وہ اپنی مشہور کتاب معاہدۂ عُمرانی (Social Contract) کا آغاز اس جملے سے کرتا ہے — انسان آزاد پیدا ہوا تھا، مگر میں اس کو زنجیروں میں بندھا ہوا دیکھتا ہوں:

Man was born free, but I see him in chain.

مگر انسان کا ایک اور مسئلہ ہے جو شاید اس سے بھی زیادہ سنگین ہے، اور وہ کنڈیشننگ ہے۔ ہر عورت اور مرد کسی ماحول میں رہتے ہیں۔ ماحول کی نسبت سے ہر ایک کے ذہن کی کنڈیشننگ ہو جاتی ہے جو اس کو صحیح طرزِ فکر سے محروم کر دیتی ہے۔ آدمی اس قابل نہیں رہتا کہ وہ فطری انداز میں سوچ سکے۔ اِس مسئلے کو دیکھتے ہوئے روسو کے جملے کو زیادہ بہتر طور پر اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ — انسان فطرت پیدا ہوا تھا، مگر وہ ہر جگہ کنڈیشنڈ دکھائی دیتا ہے:

Man was created on divine nature, but
I see him psychologically conditioned.

ایک بچہ جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، اس وقت اس کو دیکھیے تو وہ معصومیت کا پیکر دیکھائی دے گا۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے کہ فرشتے نے انسان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ پیدائش کے وقت انسان اپنے ذہن کے اعتبار سے خالص ذہن کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی سوچ عین وہی فطری سوچ ہوتی ہے جو بطور واقعہ ہونا چاہیے۔ مگر انسان ایک سماجی حیوان (social animal) ہے۔ اس کو اپنی ساری زندگی دوسروں کے بنائے ہوئے سماج کے اندر گذارنا ہوتا ہے۔ اس بنا پر اس کا ذہن ہر آن خارجی تأثر قبول کرتا رہتا ہے۔ جس کو کنڈیشننگ کہا جاتا ہے۔ یہ تاثر پذیری بڑھتی رہتی ہے، یہاں تک کہ انسان مکمل طور پر کنڈیشننگ کا کیس بن جاتا ہے۔

سن شعور کو پہنچنے کے بعد ہر عورت اور مرد کی یہ لازمی ذمّے داری ہے کہ وہ اس کنڈیشننگ کو سمجھے اور اپنے ذہن کی ڈی کنڈیشننگ کر کے دوبارہ اپنے آپ کو حالتِ فطری کی طرف واپس لے جائے، وہ اپنے آپ کو انسانِ مصنوعی کے بجائے انسانِ فطری بنائے۔

موجودہ زمانے میں علمِ نفسیات میں ایک نظریہ بہت عام ہوگیا ہے جس کو بیہیویرازم (behaviourism) کہا جاتا ہے۔ نفسیات کے اس مدرسۂ فکر میں یہ مان لیا گیا ہے کہ یہ کنڈیشننگ ہی انسان کی مستقل حالت ہے، انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے کچھ نہیں، یہ دراصل ماحول کی کنڈیشننگ ہے جو انسان کی شخصیت سازی کرتی ہے۔ اس نظریے کے حاملین کہتے ہیں کہ انسان نیچر (nature) سے نہیں بنتا۔ بلکہ وہ نرچر (nurture) سے بنتا ہے۔ یعنی ماحول کی پرورش سے۔ اس نفسیاتی مدرسۂ فکر کے لوگ کہتے ہیں کہ —انسان جہاں پیدا ہوتا ہے وہیں کے حالات اس کی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں:

He was nurtured when he was born. (Wotton)

انسانی شخصیت کی زیادہ گہری تحقیق اس نظریے کو رد کر رہی ہے۔ زیادہ گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے ایک مکمل شخصیت ہوتا ہے۔ جنیٹک کوڈ کی حالیہ دریافت مذکورہ نظریے کی مکمل تردید ہے۔ اس دریافت کے ذریعے یہ ثابت ہوا ہے کہ جنیٹک کوڈ کے اندر پیدائشی طور پر ہر انسان کی مکمل شخصیت موجود ہوتی ہے۔ بعد کے دور میں انسان کی جو شخصیت بنتی ہے، وہ اسی جنیٹک کوڈ کی صرف اَن فولڈنگ (unfolding) ہے۔

اِس نقطۂ نظر کے مطابق، زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ماحول کی کنڈیشننگ اصل انسان کے اوپر ایک مصنوعی پردے کی حیثیت رکھتی ہے۔ گویا انسان کی شخصیت پیاز کی مانند ہے۔ پیاز کے اندر مٹر کی مانند ایک مغز ہوتا ہے۔ اس داخلی مغز کے اوپر خارجی پردے کے مانند بہت سے چھلکے ہوتے ہیں۔ اگر ان چھلکوں کو ہٹایا جائے تو پیاز کا اندرونی مغز کھل کر سامنے آجائے گا۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان کی شخصیت کے اوپر ماحول کے اثر سے مصنوعی پردے پڑ جاتے ہیں۔ ان پردوں کو ہٹا دیا جائے

تو انسان کی اصل شخصیت کھل کر سامنے آجائے گی۔

انسانی شخصیت کے انھیں خارجی پردوں کو ہٹانے کا نام ڈی کنڈیشننگ ہے۔ جو آدمی سچائی کا طالب ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی ڈی کنڈیشننگ کر کے مصنوعی پَردوں کو ختم کرے تاکہ اس کی اصل شخصیت سامنے آسکے۔

مذہب میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ انسان خدا کی خاص تخلیق ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اسی خدائی شخصیت (Divine Personality) پر پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے داخلی وجود کے اعتبار سے ایک صحیح اور کامل شخصیت ہوتا ہے۔ ابدی کامیابی کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی سب سے پہلے اپنی اس فطری شخصیت کی حفاظت کرے۔ وہ اپنے آپ کو اس حالتِ فطری پر قائم کرے جس پر اس کے پیدا کرنے والے نے اس کو پیدا کیا ہے۔ اسی خود تعمیری جدوجہد کا نام ڈی کنڈیشننگ ہے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان جب ایک ماحول میں پرورش پاتا ہے تو ہر دن اس کے ساتھ مختلف منفی تجربے پیش آتے ہیں۔ یہ تجربے اس کی اصل شخصیت پر غیر مطلوب پردے ڈالتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص اس کے مقابلے میں زیادہ ترقی کر گیا۔ یہ تجربہ اس کے اندر حسد کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ اور اس کی شخصیت کے اندر حسد کا ایک عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص اس کے ساتھ ناپسندیدہ سلوک کرتا ہے۔ یہ تجربہ اس کی شخصیت میں نفرت کا ایک عنصر شامل کر دیتا ہے۔ ایک مشاہدہ اس کے سامنے آتا ہے اس کو دیکھ کر اس کے اندر وہ چیز پیدا ہوتی ہے جس کو لالچ کہا جاتا ہے۔ یہ تجربہ اس کی شخصیت میں لالچ کا ایک عنصر داخل کر دیتا ہے۔ اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اس کے ساتھ ظلم کا معاملہ کرتا ہے۔ یہ تجربہ اس کے اندر تشدد کا جذبہ جگاتا ہے، اور اس کی شخصیت میں تشدد کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔

اس طرح ماحول کے اندر آدمی کو مختلف قسم کے تجربات سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے، اور ہر تجربہ ایک منفی عنصر بن کر اس کی شخصیت کی تشکیل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان کی اصل شخصیت پردوں میں ڈھک جاتی ہے۔ انسانِ فطری بدل کر انسانِ مصنوعی بن جاتا ہے۔

ڈی کنڈیشننگ اسی مصنوعی صورتِ حال کی تصحیح ہے۔ یہ ڈی کنڈیشننگ ہر انسان کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انسان کی شخصیت ایک ناقص شخصیت بنی رہے گی، وہ کبھی کامل شخصیت کا درجہ نہ پاسکے گی۔

اس ڈی کنڈیشننگ کا بنیادی ذریعہ احتساب خویش (introspection) ہے۔ ہر عورت اور مرد کو یہ کرنا ہے کہ وہ خود اپنا نگراں بن جائے۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے اندر سے ہر منفی آئٹم کو نکالے اور اس کو فکری تصحیح کے عمل سے گذار کر مثبت آئٹم بنائے۔ اور پھر اسی مثبت آئٹم کو اپنی شخصیت میں واپس داخل کرے۔ جس طرح مویشی جگالی کر کے اپنے اندر سے غیر ہضم شدہ غذا کو نکالتے ہیں اور پھر اس کو قابل ہضم بنا کر اپنے پیٹ میں دوبارہ داخل کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر عورت اور مرد کو چاہیے کہ وہ ڈی کنڈیشننگ کے ذریعے اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کریں۔

نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کے دماغ کے دو بڑے حصے ہیں— شعور اور لاشعور۔ انسان کے ساتھ جب کوئی ناخوشگوار تجربہ گذرتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس کے ذہن کے شعوری خانے میں ایک منفی آئٹم کے طور پر داخل ہوتا ہے۔ یہ منفی آئٹم چند دن تک زندہ شعور کے خانے میں رہتا ہے۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے وہ اس کے لاشعور کے خانے میں چلا جاتا ہے۔ اور پھر ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن کا حصہ بن جاتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہر آدمی پہلے ہی دن یا چند دن کے اندر ہر منفی آئٹم کو مثبت آئٹم میں تبدیل کرے۔ تاکہ یہ آئٹم جب زندہ شعور سے گذر کر اس کے لاشعور میں یا حافظے کے اسٹور میں پہنچے تو وہ ایک مثبت آئٹم کے طور پر وہاں محفوظ ہو۔

یہی وہ عمل ہے جو انسانی شخصیت کی تعمیر میں اصل فیصلہ کن عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی عمل کے دوران یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ کوئی انسان منفی شخصیت کا حامل ہو یا مثبت شخصیت کا حامل۔

جو آدمی اپنے روزمرّہ کے تجربات پر تصحیح کا عمل کر کے اس کو مثبت آئٹم میں ڈھالتا رہے، اس کے لاشعور یا حافظے کے اسٹور میں تمام آئٹم مثبت آئٹم کے طور پر جمع ہوں گے۔ ایسے انسان کی شخصیت ایک مثبت شخصیت ہوگی۔ اس کے برعکس جو انسان تجربے کے پہلے ہی مرحلے میں تصحیح کا یہ عمل جاری نہ

کر سکے اس کو پیش آنے والے تمام منفی آئٹم اس کے لاشعور کے خانے میں صرف منفی آئٹم کے طور پر جگہ پائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی پوری شخصیت ایک منفی شخصیت بن جائے گی۔

انسان جو بھی عمل کرتا ہے، خواہ وہ اس کی سوچ ہو یا وہ اس کا قول ہو یا وہ اس کا عمل، سب کچھ اس کے لاشعور کے تحت ہوتا ہے۔ کوئی انسان اپنے شعور کے کم اور اپنے لاشعور کے زیادہ تابع ہوتا ہے۔ جس انسان کا لاشعور منفی آئٹم کا ذخیرہ بن جائے، اس کے تمام اقوال و اعمال منفی نوعیت کے ہوں گے۔ اس کے برعکس، جس انسان کا لاشعور خود تعمیری کے نتیجے میں مثبت آئٹم کا ذخیرہ بنا ہوا ہو، اس کے تمام اقوال و اعمال صحت منداور مثبت انداز کے حامل ہوں گے۔

حق کی تلاش یا حق کی یافت دونوں ہی مثبت شخصیت کا فعل ہیں۔ یہ دراصل مثبت شخصیت ہے جس کے اندر تلاشِ حق کا اعلیٰ جذبہ جاگتا ہے۔ اور یہ مثبت شخصیت ہی ہے جو اپنی سلامتِ فکر کی بنا پر آخر کار حق کی یافت کے مرحلے تک پہنچتی ہے۔

چند قابلِ غور پہلو

انسانی شخصیت

کیمسٹری کا پہلا سبق جو ایک طالب علم سیکھتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔ وہ صرف اپنی صورت بدل لیتی ہے:.Nothing dies, it only changes its form

اس عالمی کلیے سے انسان کے مستثنیٰ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جس طرح مادّے کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ جلنے یا پھٹنے یا کسی اور حادثے سے وہ فنا نہیں ہوتا بلکہ شکل بدل کر دنیا کے اندر اپنے وجود کو باقی رکھتا ہے۔ اسی طرح ہم مجبور ہیں کہ انسان کو بھی نا قابل فنا مخلوق سمجھیں اور موت کو اس کے خاتمے کے ہم معنیٰ قرار نہ دیں۔

یہ محض بالواسطہ قیاس نہیں بلکہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو براہ راست تجربے سے ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر علم الخَلِیَّہ (cytology) بتاتا ہے کہ انسان کا جسم جن چھوٹے چھوٹے خلیوں (cells) سے مل کر بنا ہے وہ مسلسل ٹوٹتے رہتے ہیں۔ ایک متوسط قد کے انسان میں ان کی تعداد تقریباً ۲۶ ٹریلین ہوتی ہے۔ یہ خلیے کسی عمارت کی اینٹوں کی طرح نہیں ہیں جو ہمیشہ وہی کے وہی باقی رہتے ہوں۔ بلکہ وہ ہر روز بے شمار تعداد میں ٹوٹتے ہیں اور غذا ان کی جگہ دوسرے تازہ خلیے فراہم کرتی رہتی ہے۔ یہ ٹوٹ پھوٹ ظاہر کرتی ہے کہ اوسطاً ہر دس سال میں ایک جسم بدل کر بالکل نیا جسم ہو جاتا ہے۔ گویا دس برس پہلے میں نے اپنے جس ہاتھ سے کسی معاہدے پر دستخط کئے تھے وہ ہاتھ اب میرے جسم پر باقی نہیں رہا۔ پھر بھی ''پچھلے ہاتھ'' سے دستخط کیا ہوا معاہدہ میرا ہی معاہدہ رہتا ہے۔ جسم کی تبدیلی کے باوجود اندر کا انسان پہلے کی طرح اپنی اصل حالت میں موجود رہتا ہے۔ اس کا علم، اس کا حافظہ، اس کی تمنائیں، اس کی عادتیں، اس کے خیالات بدستور اس کی ہستی میں شامل رہتے ہیں۔ اسی لئے ایک حیاتیاتی عالم نے کہا ہے کہ انسانی شخصیت تغیر کے اندر عدم تغیر کا نام ہے:

Personality is changelessness in change.

اگر صرف جسم کے خاتمے کا نام موت ہوتو ایسی موت تو ''زندہ'' انسانوں کے ساتھ بھی ہر روز پیش آتی رہتی ہے۔ ساٹھ سال کی عمر کا ایک شخص جس کو ہم اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا دیکھتے ہیں، وہ جسمانی خاتمے کے معنیٰ میں چھ بار مکمل طور پر مر چکا ہے۔ اب چھ بار کی جسمانی موت سے اگر ایک انسان نہیں مرا تو ساتویں بار کی موت سے کیوں اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو موت کے بعد بھی زندہ موجود رہتا ہے۔ دوسری چیزیں اگر گیس کی صورت میں باقی رہتی ہیں تو انسان اپنے شعوری وجود کی صورت میں اپنی شخصیت کو باقی رکھتا ہے۔

موت کے بعد زندگی کے اور بھی بہت سے استدلالی قرائن ہیں ان میں سے ایک نُطق (speech) ہے۔ انسان کا بولنا ایک انتہائی عجیب ظاہرہ ہے۔ نطق آدمی کی پوری شخصیت کی علامت ہے۔ یہ نطق حیرت انگیز طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔

آواز کی ریکارڈنگ کے جدید طریقوں نے اس حقیقت کو ایک معلوم اور معروف چیز بنا دیا ہے۔ ۲۴ اگست ۲۰۰۰ کی صبح کی خبروں میں میں نے ریڈیو پر سنا کہ ہندستان کے مرکزی وزیر مسٹر کمار منگلم کا آج صبح سویرے دہلی میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد رات کو آٹھ بجے دوبارہ جب میں نے ریڈیو کھولا تو اس میں اس کی تفصیلی خبر کے ساتھ وفات یافتہ وزیر کا ایک بیان ان کی اپنی آواز میں سنایا جا رہا تھا جو انھوں نے اپنی موت سے کچھ پہلے دیا تھا۔ جب میں نے ان کی آواز کو سنا تو اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے ایک شخص جو مر گیا تھا وہ دوبارہ زندہ ہو گیا ہے اور اٹھ کر لوگوں کے سامنے بول رہا ہے۔

نطق کے بارے میں یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو جدید ریکارڈنگ کے دور میں ہر ایک کے سامنے آ رہا ہے۔ یہ ایک نشانی ہے جو انسان کو بتا رہی ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ زندگی کے اگلے مرحلے میں داخل ہونا ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں مر کر موت کے بعد کی اگلی دنیا میں دوبارہ جی اُٹھنا ہے۔ انسانی زندگی کی درست منصوبہ بندی وہی ہو سکتی ہے جو موت کے بعد کی اگلی دنیا میں انسان کے ابدی دورِ حیات تک محیط ہو۔

کائناتی ماڈل

انسان اپنے آپ کو ایک وسیع کائنات میں پاتا ہے۔ یہ کائنات گویا ایک بہت بڑا سماج ہے۔ انسان اس سماج کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ انسان کو بھی اپنی زندگی میں اُسی روش کو اپنانا ہے جس روش کو کائنات کے دوسرے اجزا عملاً اپنائے ہوئے ہیں۔ یہی انسان کے لیے صحیح فطری طریقہ ہے اور اسی طریقے میں انسان کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

یہ کائناتی ماڈل کیا ہے۔ آپ خلا میں پھیلے ہوئے ستاروں اور سیاروں کو دیکھئے۔ ہر ستارہ اور سیارہ نہایت پابندی کے ساتھ اپنے اپنے مدار میں چل رہا ہے۔ ان میں سے کوئی کسی دوسرے کے مدار میں داخل نہیں ہوتا۔ اِسی ڈسپلن کی وجہ سے خلا میں ہر طرف امن قائم ہے۔ انسان کو بھی اپنے سماج میں عدم مداخلت (non-interference) کی اسی پالیسی کو اختیار کرنا ہے۔ ہر ایک کے اندر یہ زندہ شعور ہونا چاہیے کہ اس کی آزادی وہاں ختم ہوجاتی ہے جہاں سے دوسرے کی آزادی شروع ہوتی ہے۔

اسی طرح درختوں کی دنیا کو دیکھئے۔ درختوں نے خاموشی کے ساتھ یہ نظام اختیار کر رکھا ہے کہ وہ زندہ اجسام کی ضرورت پورا کرنے کے لیے مسلسل آکسیجن سپلائی کرتے ہیں اور زندہ اجسام سے نکلی ہوئی غیر مطلوب کاربن ڈائی آکسائڈ کو اپنے اندر لے لیتے ہیں۔ یہ ایک بے غرضانہ نفع بخشی کا نظام ہے۔ انسان پر بھی لازم ہے کہ وہ بھی اسی نظام کو اپنی زندگی میں اختیار کرے۔

اسی طرح آپ دیکھتے ہیں کہ پہاڑوں سے پانی کے چشمے اوپر سے نیچے کی طرف جاری ہوتے ہیں۔ ان چشموں کے ساتھ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ راستے میں ان کے سامنے ایسے پتھر آتے ہیں جو بظاہر ان کے سفر کے لیے رکاوٹ ہوتے ہیں۔ مگر چشمہ ایسا نہیں کرتا کہ وہ پتھر کو ہٹا کر اپنا راستہ بنانے کی کوشش کرے۔ اس کے بجائے وہ یہ کرتا ہے کہ وہ پتھر کے کنارے سے اپنا راستہ بنا کر آگے چلا جاتا ہے۔ یہ گویا اس بات کا پیغام ہے کہ — رکاوٹوں سے نہ ٹکراؤ بلکہ رکاوٹوں سے ہٹ کر اپنی سرگرمی جاری کرو۔

اسی طرح حیوانات کی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بار بار ان کے درمیان کوئی نزاعی اِشو پیدا ہوتا ہے مگر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ وقتی طور پر کچھ غُرّا کر یا سینگ مار کر وہ اس کو بھلا دیتے ہیں اور جلد ہی وہ ایسے

نارمل ہو جاتے ہیں جیسے کہ کچھ نہیں ہوا۔ اسی طرح انسان کو اپنے سماج میں رہنا ہے۔ سماجی زندگی میں بار بار ایسی چیزیں پیش آتی ہیں جو کسی عورت یا مرد کو ناگوار ہوتی ہیں۔ مگر ہر ایک کو یہ کرنا ہے کہ وہ اس ناگواری کو وقتی بنادے۔ وہ اس کو مستقل تلخی کی صورت نہ اختیار کرنے دے۔

فطرت کی دنیا کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں ہر چیز دوسروں کو کچھ دیتی ہے مگر وہ دوسروں سے اپنے لیے کچھ نہیں لیتی۔ مثلاً سورج یکطرفہ طور پر اہلِ دنیا کو روشنی دیتا ہے مگر وہ اس کی کوئی قیمت وصول نہیں کرتا۔ ہَوا مسلسل طور پر آکسیجن سپلائی کرنے کا کام کر رہی ہے مگر وہ اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیتی۔ اسی طرح موجودہ دنیا کی تمام چیزیں بلا معاوضہ لوگوں کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں، حالاں کہ ان میں سے کوئی بھی چیز اپنی خدمت کے لیے اپنا بل اُن لوگوں کے پاس روانہ نہیں کرتی جو اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اِس سے معلوم ہوا کہ آس پاس کی جو دنیا ہے وہ پوری دنیا ایک دینے والی دنیا (giver world) ہے، وہ لینے والی دنیا (taker world) نہیں۔ گویا کہ اس دنیا کا کلچر دینے والا کلچر (giver culture) ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز مسلسل یہ پیغام دے رہی ہے کہ دوسروں سے لیے بغیر دوسروں کو دینے والے بنو۔

انسان کو یہی دینے والا کلچر اپنانا ہے۔ اس کو اپنے معاشرے میں دینے والا بن کر رہنا ہے نہ کہ لینے والا۔ انسان کے لیے اس کے گرد وپیش کی کائنات ایک وسیع ماڈل ہے۔ انسان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ اس ماڈل کو اپنی زندگی میں اختیار کرے، صرف اِس فرق کے ساتھ کہ انسان کے سوا بقیہ کائنات میں یہ ماڈل قانونِ فطرت کے تحت مجبورانہ طور پر قائم ہے۔ جب کہ انسان اِس کائناتی ماڈل کو اپنی زندگی میں شعوری طور پر خود اپنے اختیار کے تحت قائم کرے گا۔

اپنے آزادانہ اختیار کو کائناتی ڈسپلن کے تحت لانا، گویا اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو بے اختیار کر لینا ہے۔ قانونِ فطرت کے مقابلے میں یہی سپردگی (submission) کا رویہ انسان کے لیے صحیح ترین رویّہ ہے۔ یہی وہ رویہ ہے جو انسان کے ابدی دورِ حیات میں کامیابی کا ضامن ہوگا۔

انسان کی دریافت

خدا تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے—

God is the eternal source of all kinds of beauty and goodness.

خدا نے انسان کو بنایا۔ انسان اپنی ذات میں ایک مکمل وجود ہے۔ اس کے اندر ہر قسم کی اعلیٰ صلاحیتیں کمال درجے میں موجود ہیں۔ انسان کے دماغ (brain) میں 100 million billion billion پارٹیکل ہیں۔ یہ واقعہ اس بات کی علامت ہے کہ انسان کے خالق نے انسان کے اندر لامحدود صلاحیتیں رکھ دی ہیں۔

اسی کے ساتھ انسان کو ایک ایسی انوکھی چیز دی گئی ہے جو وسیع کائنات میں کسی کو حاصل نہیں۔ یہ ہے احساسِ مسرت۔ انسان اس کائنات میں واحد مخلوق ہے جو pleasure کا احساس رکھتا ہے اور pleasure سے انجوائے کرنے کی لامحدود capacity کا مالک ہے۔ انسان کے لیے ہر چیز امکانی طور پَر خوشی کا ذریعہ ہے۔

خدا نے اسی قسم کی انوکھی صلاحیتوں کے ساتھ انسان کو پیدا کیا۔ اس کے بعد خدا نے ایک حسین دنیا بنائی جس کا نام اس نے جنت رکھا۔ جنت ایک perfect world ہے جس میں ہر قسم کا pleasure اپنی آخری perfect صورت میں موجود ہے۔ انسان اور یہ جنت دونوں گویا ایک دوسرے کا مثنیٰ (counter part) ہیں۔ انسان جنت کے لیے ہے اور جنت انسان کے لیے۔ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسان کو پورا fulfilment ملے۔ جنت گویا انسان کی تکمیل ہے۔ جنت کے بغیر انسان بے معنی ہے اور انسان کے بغیر جنت بے معنٰی۔ جنت کے بغیر انسان کی زندگی ادھوری ہے اور انسان کے بغیر جنت ادھوری۔

انسان اس جنت کا امکانی باشندہ ہے مگر یہ جنت کسی انسان کو پیدائشی یا نسلی حق کے طور پر نہیں ملتی۔ جنت میں داخلے کی شرط یہ ہے کہ انسان یہ ثابت کرے کہ وہ اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اس کا مستحق ہے۔ موجودہ دنیا کو خدا نے اسی مقصد کے لیے selection ground کے طور پر بنایا ہے۔

موجودہ دنیا کے حالات اس طرح بنائے گئے ہیں کہ یہاں کا ہر جزءانسان کے لیے ایک ٹسٹ پیپر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں انسان ہر لمحہ trial پر ہے۔ خدا ہر انسان کے قول وعمل کا record تیار کررہا ہے۔ اسی record کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ کون عورت اور مرد ہیں جو جنت میں بسانے کے لیے اہل باشندہ (eligible citizen) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

انسان کو اس دنیا میں مکمل آزادی ملی ہوئی ہے۔ یہ آزادی انعام کے طور پر نہیں بلکہ test کے طور پر ہے۔ خدا یہ دیکھ رہا ہے کہ انسان اپنی آزادی کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ جو عورت اور مرد اپنی آزادی کو خدا کے نقشے کے مطابق درست طور پر استعمال کریں ان کو جنّت میں بسانے کے لیے چُنا جائے گا اور جو لوگ آزادی کو misuse کریں وہ day of judgement میں قابلِ رد (rejected lot) قرار پائیں گے۔

انسان کی زندگی دو دوروں میں تقسیم ہے۔ قبل ازموت دور (pre-death period) اور بعد ازموت دور (post-death period)۔ قبل ازموت دور امتحانی دور (trial period) ہے اور بعد ازموت دور انعام پانے کا دور (reward period)۔ یہی وہ سب سے بڑی حقیقت ہے جس کو جاننے اور اختیار کرنے میں انسان کی کامیابی اور ناکامی کا راز چھپا ہوا ہے۔

یہ نمبر موجود نہیں!

آپ اگر اپنے ٹیلی فون پر کسی شخص کا نمبر ڈائل کریں اور کوئی غلط بٹن دب جائے تو آپ کی کال مطلوب شخص تک نہیں پہنچے گی۔ آپ کو دوسری طرف سے ہیلو کی آواز نہیں آئے گی بلکہ کمپیوٹرائزڈ سسٹم کے تحت یہ ہوگا کہ ٹیلی فون ایکسچنج سے ریکارڈ کی ہوئی ایک آواز سنائی دے گی۔ ۳۱ اکتوبر ۲۰۰۴ کو میرے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ میں نے اپنے ٹیلی فون پر دہلی کے ایک صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے یہ آواز سنائی دی — یہ نمبر موجود نہیں:

This number does not exist.

ایکسچنج کی یہ آواز سن کر اچانک میرے ذہن میں خیالات کا ایک طوفان بَرپا ہوگیا۔ میں نے

سوچا کہ اس مادی واقعے میں ایک بہت بڑا روحانی سبق موجود ہے۔ وہ یہ کہ اگر کوئی انسان خدا سے ربط قائم کرنا چاہے اور وہ اپنے غلط ذہن کی بنا پر خدا کے سوا کسی اور کو اپنا خدا سمجھ بیٹھے اور خدا سمجھ کر اس کو پکارنے لگے تو اس کے ساتھ بھی یہی ہوگا کہ براہِ راست خدا کی طرف سے تو اس کو کوئی جواب نہیں ملے گا۔ البتہ ایک اور آواز اس کو سنائی دے گی جو اس سے کہہ رہی ہوگی کہ تم نے جس خدا کو پکارا ہے وہ خدا سرے سے موجود نہیں:

This God does not exist

خدا کی طلب انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر خدا کو پانا چاہتا ہے۔ مگر تاریخ میں ہمیشہ یہ ہوا ہے کہ لوگوں نے یہ غلطی کی کہ خدا کے سوا کسی اور کو خدا کا درجہ دے دیا۔ حقیقی خدا سے رشتہ قائم ہونا انسان کے لیے سب سے بڑی رحمت ہے۔ جس عورت یا مرد کا رشتہ خدا کے ساتھ قائم ہو جائے اس کی زندگی میں ہدایت کی روشنی آجائے گی۔ اس کے اندر روحانی شخصیت پیدا ہوگی۔ اس کو ذہنی ارتقاء کا اعلیٰ درجہ حاصل ہوگا۔ اس کے برعکس جو شخص کسی غیرِ خدا کو خدا کا درجہ دے دے وہ ہمیشہ اندھیروں میں بھٹکتا رہے گا۔

موجودہ زمانے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر آدمی خدا کا نام لیتا ہے۔ ہر آدمی کسی نہ کسی چیز کو خدا کا درجہ دے کر اس کو اپنائے ہوئے ہے۔ مگر جہاں تک روحانی شخصیت کا تعلق ہے، اس کا حقیقی معنوں میں کہیں وجود نہیں۔ اس کا سبب واضح طور پر یہی ہے کہ لوگ غیر خداؤں کو اپنا خدا بنائے ہوئے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی غیر خدا کو ٹیلی فون کر رہے ہیں۔ مگر جواب میں ہر ایک کے پاس یہ آواز آرہی ہے کہ جو نمبر تم نے ڈائل کیا ہے وہ نمبر موجود نہیں، جس کو تم خدا سمجھ کر پکار رہے ہو اس خدا کا کہیں وجود ہی نہیں، اس لیے تم کو اس کی طرف سے کوئی جواب بھی ملنے والا نہیں۔

ہر آدمی کی یہ پہلی ذمے داری ہے کہ وہ حقیقی خدا کو دریافت کرے اور پھر یہ معلوم کرے کہ اس خدا سے ربط قائم کرنے کا ذریعہ اس کے لیے کیا ہے۔ اس دریافت کے بغیر انسانی زندگی نہ صرف نامکمل ہے بلکہ وہ یقینی طور پر تباہی کے انجام سے دوچار ہونے والی ہے۔ یہی کسی انسان کا سب سے بڑا مقصد

ہے، یہی انسان کی جدوجہد کا سب سے بڑا نشانہ ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسانی زندگی کو بامعنی بناتی ہے۔ جس انسان کی زندگی اس دریافت سے خالی ہو وہ بلاشبہہ سب سے بڑا مفلس ہے، خواہ بظاہر اس نے مادی چیزوں کا ڈھیر اپنے گرد اکھٹا کرلیا ہو۔

خدا کی دریافت سے مُراد بَرتَر سچائی (higher truth) کی دریافت ہے۔ اور اس بَرتَر سچائی کی دریافت اور اس سے تعلق قائم کرنا ہی وہ چیز ہے جو انسان کی زندگی کو بامعنٰی بناتی ہے۔ یہ دریافت نہیں تو زندگی بامعنٰی بھی نہیں۔

مزید سنگین بات یہ ہے کہ کسی انسان کو یہ موقع صرف قبل ازموت مدت حیات میں ملتا ہے۔ بعد ازموت کی مدت حیات میں کسی انسان کو یہ موقع ملنے والا نہیں۔ انسان کے لیے اُس کے خالق کا بنایا ہوا قانون یہ ہے — موت سے پہلے کی زندگی میں کرنا، اور موت کے بعد کی زندگی میں اُس کا انجام پانا۔

شخصیت کی تعمیر

تجربہ بتاتا ہے کہ انسان بچپن میں معصوم کلی کی مانند ہوتا ہے۔لیکن بڑا ہونے کے بعد اس کی شخصیت میں طرح طرح کے بگاڑ آجاتے ہیں۔مثلاً ضد اور سرکشی وغیرہ۔شخصیت کی تعمیر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنی پیدائشی فطرت کو اُسی حالت میں محفوظ رکھے،جس حالت میں وہ ماں کے پیٹ سے نکلا تھا۔یا وہ مویشیوں کی طرح جُگالی کا طریقہ اختیار کرے۔یعنی بعد کو اس کی شخصیت پر جو مصنوعی پردے پڑ گیے تھے،اُن کو ایک ایک کر کے ہٹانا، یہاں تک کہ اصل فطرت آمیزشوں سے پاک ہو کر سامنے آجائے۔

اِس معاملے میں فطرت کی ایک مثال وہ ہے جس کا تعلق لوہے سے ہے۔لوہا ابتدائی طور پر ایک خالص دھات ہوتا ہے۔مگر پانی کے زیر اثر آنے سے اس میں زنگ لگ جاتا ہے۔یہ زنگ لوہے کے لیے صرف ایک اوپری چیز ہوتا ہے۔اگر رگڑ کر زنگ کو مٹا دیا جائے تو لوہا دوبارہ اپنی خالص صورت میں سامنے آجائے گا۔

یہ تمثیل کی زبان میں ایک نفسیاتی معاملہ کو بتایا گیا ہے۔جب کوئی انسان برائی کرے اور پھر وہ جلد ہی متنبہ ہو جائے۔وہ برائی کے احساس کو اپنے دل سے نکال ڈالے تو اس کا دل پاک وصاف ہو جاتا ہے۔لیکن اگر ایسا ہو کہ آدمی ایک کے بعد ایک برائی کرتا رہے۔وہ اپنا محاسبہ کر کے اپنے دل سے اس کے اثر کو زائل نہ کرے تو دھیرے دھیرے اس کا پورا دل بے حسی کا شکار ہو جاتا ہے۔اب وہ برائیوں ہی میں جینے لگتا ہے اور سچائی کی بات اس کو متاثر نہیں کرتی۔

جدید نفسیاتی مطالعے نے اس معاملے کو مزید واضح کیا ہے۔اب یہ بات ایک پراسرار عقیدہ نہیں رہی، بلکہ وہ ایک معلوم حقیقت بن گئی ہے۔اب وہ خالص علمی اعتبار سے انسان کے لیے قابل فہم ہے۔

جدید نفسیاتی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ انسان کے دماغ کے تین بڑے حصے ہیں۔یہ تینوں

حصے ہر عورت اور ہر مرد کے دماغ میں پائے جاتے ہیں۔ وہ پیدائشی طور پر ہر انسانی دماغ کا حصہ ہیں۔ وہ تین حصے یہ ہیں:

۱۔ شعوری ذہن (conscious mind)

۲۔ تحت شعور (sub-conscious mind)

۳۔ لاشعور (unconscious mind)

تجربہ وتحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ کوئی بھی خیال جب ایک بار دماغ میں آجائے تو وہ ہمیشہ کے لیے انسانی دماغ کا حصہ بن جاتا ہے، اور جیسا کہ معلوم ہے، انسانی دماغ ہی دراصل انسانی شخصیت کا دوسرا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی خیال انسان کے دماغ میں آجائے تو وہ ہمیشہ کے لیے انسان کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ اس کو اپنی شخصیت سے الگ کرنا چاہے تو وہ اس کو الگ کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔

جب کوئی بات انسان کے دماغ میں آتی ہے، خواہ وہ منفی ہو یا مثبت تو وہ سب سے پہلے دماغ کے شعوری حصے میں آتی ہے۔ اس کو زندہ حافظہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد آدمی جب رات کو سوتا ہے تو فطری عمل کے تحت اپنے آپ ایسا ہوتا ہے کہ وہ بات شعوری ذہن سے چل کر ذہن کے تحت شعور حصے میں پہنچ جاتی ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو اس خیال کے اوپر آدمی کا شعوری کنٹرول صرف پچاس فیصد رہ جاتا ہے۔ پچاس فیصد وہ اس کے شعوری کنٹرول سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ اگلی رات کو سوتا ہے تو یہ خیال مزید سفر کر کے ذہن کے لاشعور حصے میں پہنچ جاتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو اس کے بعد یہ خیال اس کے شعوری کنٹرول سے پوری طرح باہر ہو جاتا ہے۔

انسانی ذہن کے یہ تینوں حصے شعور کے اعتبار سے ذہن کی تین حالتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مگر جہاں تک انسانی شخصیت کا تعلق ہے، وہ ہر حال میں یکساں طور پر اُس کا معمول بنی رہتی ہے۔ کوئی خیال جب تک زندہ حافظے میں ہو تو وہ انسانی شخصیت کا معلوم حصہ ہوتا ہے۔ مگر جب وہ تحت شعور میں پہنچ جائے تو اگرچہ اب بھی وہ مکمل طور پر انسانی شخصیت کا حصہ ہوتا ہے مگر عام حالات

میں وہ انسان کے علم میں تازہ نہیں ہوتا۔

یہی روزمرہ کے افکار جو انسان کے ذہن میں آتے ہیں وہی اس کی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔ جیسے افکار ویسی شخصیت۔ مثبت افکار سے مثبت شخصیت بنے گی۔ لیکن اگر یہ افکار منفی افکار ہوں تو انسان کی شخصیت بھی منفی بنتی چلی جائے گی۔

آج کل یہ حال ہے کہ آپ جس عورت یا مرد سے ملیے ہر ایک کو آپ منفی سوچ میں مبتلا پائیں گے۔ اگر کوئی شخص بظاہر اچھی باتیں کرتا ہوا نظر آئے تب بھی اس کی یہ بات صرف اوپری طور پر ہوگی۔ اگر آپ مزید گفتگو کر کے اس کی اندرونی شخصیت کو جاننے کی کوشش کریں تو آپ پائیں گے کہ اس کی اندرونی شخصیت بھی اُتنی ہی منفی تھی جتنی کہ دوسروں کی شخصیت۔ اس طرح موجودہ زمانے کا ہر آدمی اپنے آپ کو منفی قبرستان میں دفن کیے ہوئے ہے، اگرچہ اس کو خود بھی اس ہلاکت خیز واقعے کی خبر نہیں۔ اس میں غالباً مذہبی انسان اور سیکولر انسان میں کوئی فرق نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سب سے بُری شخصیت منفی شخصیت ہے اور سب سے زیادہ اچھی شخصیت وہ ہے جو مثبت شخصیت ہو۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ مثبت شخصیت کی تعمیر کس طرح کی جائے۔ مذکورہ نفسیاتی تحقیق کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو اس کی ایک واضح عملی صورت بنتی ہے۔ اس کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

اس عمل کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی منفی خیال آدمی کے ذہن میں آجائے تو وہ اس کو پہلے ہی مرحلے میں ختم کردے۔ خصوصی تدبیر کے ذریعے اُس کے منفی پہلو کو مثبت پہلو میں تبدیل کرلے۔ مثلاً وہ غصہ ہو تو فوراً معاف کردے تاکہ اس کا غصہ انتقام کی صورت اختیار نہ کرنے پائے۔ کسی کی ترقی اُس کو پسند نہ آئے تو اُسی وقت وہ اس کو نظرانداز کردے تاکہ وہ اس کی شخصیت میں حسد بن کر شامل نہ ہوسکے، وغیرہ۔

ہر بُرے خیال کے ساتھ فوراً ہی تبدیلی کا یہ عمل کرنا چاہیے۔ اگر اس میں دیر ہوئی تو جلد ہی ایسا ہوگا کہ وہ آدمی کے تحت شعور میں چلا جائے گا۔ اور پھر کچھ عرصے بعد وہ اس کے لاشعور میں داخل

ہو جائے گا۔اور جب ایسا ہوگا تو وہ آدمی کی شخصیت کا اس طرح لازمی حصہ بن جائے گا کہ آدمی چاہے بھی تو وہ اس کو اپنے سے جُدا نہ کر سکے۔

لوگ عام طور پر ایسا نہیں کرتے اور اس کی یہ بھیانک قیمت ادا کر رہے ہیں کہ ہر ایک، خوبصورت کپڑوں کے پیچھے ایک منفی شخصیت کی لاش لیے ہوتا ہے۔منفی شخصیت دراصل جہنمی شخصیت ہے۔جو عورت یا مرد اس ہلاکت خیز انجام سے بچنا چاہتے ہوں ان کو چاہیے کہ وہ مذکورہ عمل تصحیح کو اپنی روزانہ کی زندگی میں شامل کر لیں۔اس کے سوا اس مسئلے کا کوئی اور حل موجود نہیں۔

پھول اور کانٹا

انسان کا عرصۂ حیات (life span) بلین سال سے بھی زیادہ ہے۔ مگر یہ عرصۂ حیات دو مختلف دوروں میں بٹا ہوا ہے — موت سے پہلے تقریباً سو سال اور بقیہ پوری مدت، موت کے بعد۔ پہلے دور کی زندگی آج کی دنیا میں گزرتی ہے اور بعد کے دور کی زندگی کل کی دنیا میں گزرے گی۔

آج کی دنیا ایک مخلوط جنگل کی مانند ہے۔ یہاں پھول بھی ہیں اور اسی کے ساتھ کانٹے بھی۔ کل کی دنیا میں پھول اور کانٹے ایک دوسرے سے الگ کر دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد ایک ایسی ابدی دنیا بنے گی جس کے ایک حصے میں کانٹے ہی کانٹے ہوں گے اور دوسرے حصے میں پھول ہی پھول۔ آج کی دنیا میں ہر آدمی کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ اپنے ابدی مستقبل کی تشکیل کرے۔ وہ اپنی زندگی کے ریکارڈ سے بتائے کہ کل کی دنیا میں وہ کانٹوں کے جنگل میں بسائے جانے کے قابل ہے یا پھولوں کے ابدی باغ میں۔

آج کی دنیا میں یہی گروپ بندی ہو رہی ہے۔ ہر آدمی اپنی زندگی کے ریکارڈ سے یہ بتا رہا ہے کہ وہ دونوں گروپوں میں سے کس گروپ میں شامل کئے جانے کے لائق ہے۔ کانٹوں والے گروپ میں یا پھولوں والے گروپ میں۔ آج کی دنیا کے حالات دراصل اسی شخصیت سازی کا ذریعہ ہیں۔ ہر عورت اور مرد اسی عمل سے گزر رہے ہیں۔ کوئی اپنے اندر کانٹوں والی شخصیت بنا رہا ہے اور کوئی اپنے اندر پھولوں والی شخصیت کی تعمیر کر رہا ہے۔ آج کی دنیا میں یہ دونوں قسم کے لوگ بظاہر الگ الگ دکھائی نہیں دیتے مگر کل کی دنیا میں دونوں قسم کے لوگ ایک دوسرے سے پوری طرح الگ ہو جائیں گے۔ وہاں پھولوں والی شخصیت صرف پھول کے روپ میں دکھائی دے گی اور کانٹوں والی شخصیت صرف کانٹے کے روپ میں۔

شخصیت سازی کے اس دوطرفہ عمل کو دوسرے لفظوں میں مثبت شخصیت اور منفی شخصیت کہہ سکتے ہیں۔ آج کی دنیا میں ہر آدمی کو منفی تجربات پیش آتے ہیں۔ اب ایک شخص وہ ہے جو ان منفی تجربات کو منفی حیثیت ہی سے لے لے۔ ایسے آدمی کے اندر منفی شخصیت بنے گی، دوسرا آدمی وہ ہے جو منفی تجربے

کو مثبت غذا میں تبدیل کر سکے۔ مثلاً ایک شخص آپ کو برا کہتا ہے۔ ایک شخص آپ کو ستاتا ہے۔ ایک شخص آپ کے ساتھ اشتعال انگیزی کرتا ہے۔ ایک شخص آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ایک شخص آپ کے خلاف تخریب کاری کرتا ہے۔ اب آپ کے لیے جواب (response) کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ ویسا ہی کریں جیسا کہ دوسرے شخص نے آپ کے ساتھ کیا۔ یعنی جو شخص آپ کو برا کہے آپ بھی اس کو برا کہیں، جو شخص آپ کو ستائے آپ بھی اس کو ستائیں۔ جو شخص آپ کو نقصان پہنچائے آپ بھی اس کو نقصان پہنچائیں جو شخص آپ کے خلاف تخریب کاری کرے آپ بھی اس کے خلاف تخریب کاری کریں۔ جو شخص آپ کو اشتعال دلائے آپ بھی اس کے مقابلے میں مشتعل ہو جائیں، وغیرہ۔

جو آدمی ایسا کرے اس نے اپنے اندر منفی شخصیت بنائی۔ اس نے اپنے سینے میں کانٹوں کی فصل اگائی۔ ایسے آدمی کی شخصیت کانٹوں والی شخصیت ہے۔ وہ موت کے بعد کی اگلی دنیا میں کانٹوں والی شخصیت کے طور پر اٹھے گا اور پھر کانٹوں سے بھرے ہوئے جنگل کے اندر اس کو ڈال دیا جائے گا تاکہ ابد تک وہ حسرت اور غم کی زندگی گزارتا رہے۔

اس کے برعکس، دوسرا انسان وہ ہے جس نے دوسروں کی منفی روش کا مقابلہ مثبت رسپانس سے کیا۔ جس کو دوسروں نے برا کہا مگر خود اس نے کسی کو برا نہیں کہا۔ دوسروں نے اس کو ستایا مگر اس نے کسی کو نہیں ستایا۔ جس کے خلاف دوسروں نے انتقامی کارروائی کی مگر اس نے دوسروں کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ جس کے خلاف دوسروں نے تخریب کاری کی مگر اس نے اپنی طرف سے کسی کے خلاف تخریب کاری نہیں کی۔ جس کو دوسروں نے نقصان پہنچایا مگر اس نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ جس کے خلاف دوسروں نے اشتعال انگیزی کی مگر اس نے کسی کے خلاف کبھی اشتعال کے تحت کوئی کارروائی نہیں کی۔

یہ دوسرا انسان وہ ہے جو کانٹوں کے درمیان پھول بن کر رہا۔ اس نے اپنے اندر پھول جیسی شخصیت کی تعمیر کی۔ ایسے انسان کو اگلی دنیا میں یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ پھولوں کے باغ میں رہے۔ آج کی کانٹوں بھری دنیا میں پھول والی شخصیت بنانے کی تدبیر کیا ہے۔ اس کے لیے فطرت نے آج

کی دنیا میں کچھ زندہ نمونے قائم کر دیے ہیں۔ گائے اسی قسم کا ایک نمونہ ہے۔ گائے فطرت کی ایک انڈسٹری ہے جس کو باہر کی دنیا سے گھاس کھانے کو ملتی ہے مگر وہ اپنے داخلی میکانزم کے تحت، گھاس کو دودھ میں کنورٹ کرتی ہے۔ یہی معاملہ ہر عورت اور مرد کو اس دنیا میں کرنا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو مسلسل یہ کرنا ہے کہ وہ ''گھاس'' کو ''دودھ'' کی صورت میں تبدیل کرتا رہے۔

انسان کے ذہن کے دو بڑے خانے ہیں۔ ایک، شعوری ذہن (conscious mind) دوسرا، لاشعوری ذہن (unconscious mind)۔ جب بھی کوئی بات آدمی کے ذہن میں آتی ہے تو پہلے وہ اس کے ذہن کے شعور کے خانے میں آتی ہے۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے وہ آگے بڑھ کر اس کے ذہن کے لاشعور کے خانے میں پہنچ جاتی ہے۔ لاشعور آدمی کے ذہن کا وہ خانہ ہے جہاں ہر بات دوامی طور پر محفوظ رہتی ہے مگر وہ آدمی کے شعور کی گرفت میں نہیں رہتی۔ جو آدمی پھول والی شخصیت بننا چاہے اس کو یہ کرنا ہوگا کہ جب بھی کوئی منفی آئٹم اس کے شعوری ذہن میں آئے تو اُسی وقت وہ اپنی سوچ کو متحرک کر کے اس منفی آئٹم کو مثبت آئٹم میں تبدیل کرے تاکہ جب آگے بڑھ کر یہ آئٹم آدمی کے لاشعور کے اسٹور میں محفوظ ہو تو وہاں وہ مثبت آئٹم کے طور پر محفوظ ہو نہ کہ منفی آئٹم کے طور پر۔ مثلاً کوئی بات اس کے شعور میں نفرت کے احساس کے طور پر آئے تو اس کو diffuse کر کے وہ اس کو محبت کے احساس میں تبدیل کرے۔ کوئی بات حسد کے احساس کے طور پر اس کے دماغ میں آئے تو وہ اس کو بدل کر اعتراف کے احساس میں تبدیل کر لے۔ کسی بات پر اس کا ایگو (ego) بھڑکے تو وہ اس کو بدل کر تواضع کی صورت دے دے۔ کوئی تجربہ اس کے اندر خودغرضی کا احساس پیدا کرے تو وہ بدل کر اس کو بے غرضی کا احساس بنا دے۔ کسی واقعے میں اس کو اپنی حق تلفی دکھائی دے تو اس کو وہ بدل کر شکر کے احساس میں ڈھال لے۔

جو عورت یا مرد اپنے اندر اس طرح کی شخصیت تعمیر کریں ان کا حال یہ ہوگا کہ ان کے شعور کا اسٹور مکمل طور پر مثبت آئٹم کا خزانہ بن جائے گا۔ وہ منفی آئٹم سے پوری طرح خالی ہوگا۔ ایسی مثبت شخصیت والے لوگ ہی موت کے بعد کی ابدی دنیا میں پھولوں والے باغ میں جگہ پائیں گے۔ جہاں وہ ابدی طور پر خوشی اور آرام کی زندگی گزاریں۔

یہ تضاد کیوں

شیلے (Percy Bysshe Shelley) ایک انگلش شاعر ہے۔ وہ ۱۷۹۲ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۲۲ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے ایک بار کہا تھا کہ ہمارے سب سے زیادہ شیریں نغمے وہ ہیں جو سب سے زیادہ غم ناک نغمے ہیں:

Our Sweetest songs are those that are saddest songs.

یہ ایک عام تجربے کی بات ہے۔ ہر عورت اور مرد کا یہ حال ہے کہ اس کو دردناک کہانیاں یا غم انگیز اشعار زیادہ پسند آتے ہیں۔ اکثر مقبول ناول وہ ہیں جو طربیہ نہیں ہیں بلکہ المیہ ہیں۔ اسی طرح اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ گیت کار زیادہ مقبول ہوتے ہیں جو پُرسوز لہجے میں گانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ پُرسوز اشعار یا پُرسوز کہانیاں انسان کے دل کے تاروں کو چھیڑنے میں زیادہ کامیاب ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر انسان عملاً محرومی یا عدم یافت کی نفسیات میں جیتا ہے۔ ایسی حالت میں خوشی کی بات اس کو غیر واقعی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں غم کی بات اس کو زیادہ مبنی بَر واقعہ نظر آتی ہیں۔

زیادہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسان ایک لذت پسند حیوان ہے:

Man is a pleasure-seeker animal.

ناقابلِ پیمائش حد تک وسیع کائنات کے اندر انسان ایک استثنائی مخلوق ہے۔ اِس عالم میں انسان ایک واحد مخلوق ہے جو احساس لذّت کی صفت رکھتا ہے۔ یہ انسان کی انوکھی صفت ہے کہ وہ مختلف قسم کی لذّتوں کا احساس رکھتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ وسیع کائنات میں بے شمار مخلوقات ہیں مگر لذت سے لطف اندوز ہونے کی صفت استثنائی طور پر صرف انسان کے اندر پائی جاتی ہے۔

انسان کے لیے سوچنا بھی لذت ہے، دیکھنا بھی لذّت ہے، سننا بھی لذت ہے، بولنا بھی لذّت

ہے، کھانا اور پینا بھی لذت ہے، سونگھنا بھی لذت ہے اور چھونا بھی لذت ہے، حتی کہ ہری گھاس کا لان ہو اور اس پر آپ ننگے پاؤں چلیں تو اِس لمس میں بھی آپ کو بے پناہ لذت محسوس ہوگی۔

مگر یہاں ایک عجیب تضاد پایا جاتا ہے۔ انسان کے اندر لذت کا احساس تو انتہا درجے میں موجود ہے مگر لذت سے لطف اندوز ہونا اس دنیا میں اس کے لیے ممکن نہیں۔ میں ایک بار کشمیر گیا، وہاں پہل گام کے علاقے میں ایک پہاڑی دریا ہے جو پہاڑوں کے اوپر برف پگھلنے سے جاری ہونے والے چشموں کے ذریعہ سے بنتا ہے۔ اس کا پانی انتہائی خالص پانی ہے۔ جب میں پہل گام پہنچا اور وہاں دریا کے صاف وشفاف پانی کو دیکھا تو مجھے خواہش ہوئی کہ میں اس کا پانی پیوں۔ میں نے بہتے ہوئے دریا سے ایک گلاس پانی لے کر پیا تو وہ مجھے بہت زیادہ اچھا لگا، تمام مشروبات سے زیادہ اچھا۔ میں نے ایک گلاس کے بعد دوسرا گلاس پیا، یہاں تک کہ میں چھ گلاس پانی پی گیا۔

چھٹے گلاس کے بعد بھی میرا اشتیاق باقی تھا، مگر میں مزید پانی نہ پی سکا۔ اب میرے سر میں سخت درد شروع ہوگیا۔ درد اتنا شدید تھا کہ مجھے فوراً وہاں سے واپس ہونا پڑا۔ میں واپس ہوکر سری نگر پہنچا۔ سری نگر میں ایک کشمیری تاجر کے یہاں میرے شام کے کھانے کا انتظام تھا۔ کئی اور لوگ اِس موقع پر بلائے گیے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو میرے سر میں اتنا شدید درد ہو رہا تھا کہ میں کھانے میں شریک نہ ہوسکا۔ بلکہ ایک اور کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

یہی حال دنیا کی تمام لذتوں کا ہے۔ انسان دولت کماتا ہے۔ اقتدار حاصل کرتا ہے۔ اپنی پسند کی شادی کرتا ہے۔ اپنے لیے شان دار گھر بناتا ہے۔ عیش کے تمام سامان اکٹھا کرتا ہے۔ مگر جب وہ یہ سب کچھ کر چکا ہوتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اور لذتوں کے درمیان ایک حتمی رکاوٹ حائل ہے۔ کسی بھی لذت سے وہ اپنی خواہش کے مطابق لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ لذت کے تمام سامان بھی اس کو خوشی اور سکون دینے میں ناکام رہتے ہیں۔

لذتوں کے بارے میں انسان کی خواہش لامحدود ہے۔ مگر لذتوں کو استعمال کرنے کے لیے وہ خود ایک محدود صلاحیت رکھنے والا انسان ہے۔ انسان کی یہی محدودیت ہر جگہ اس کے اور سامانِ لذت

کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ سب کچھ پانے کے بعد بھی وہ بدستور احساسِ محرومی میں مبتلا رہتا ہے۔ انسان کی جسمانی کمزوری، جوانی کا زوال، بڑھاپا، بیماری، حادثات اور آخر میں موت، مسلسل طور پر اس کی خواہشوں کی نفی کرتے رہتے ہیں۔ لذت کا سامان حاصل کر لینے کے باوجود یہ ہوتا ہے کہ جب وہ اس کو استعمال کرنا چاہتا ہے تو خواہش کی تکمیل سے پہلے ہی اس کی طاقت کی حد آ جاتی ہے۔ وہ ایک ختم شدہ طاقت (spent force) کی مانند بن کر رہ جاتا ہے۔

اس تضاد کو لے کر مزید مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تضاد در اصل تضاد نہیں ہے بلکہ وہ ترتیب کے فرق کا نتیجہ ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ فطرت کے نظام کے تحت، انسان کے لیے یہ مقدر کیا گیا ہے کہ وہ موت سے قبل کے دَور میں اپنی مطلوب لذتوں کا صرف تعارف حاصل کرے اور موت کے بعد کے دَور میں ان لذتوں کو حقیقی طور پر اور مکمل طور پر حاصل کرے۔

یہ ترتیب اتفاقی نہیں ہے، وہ خود فطرت کا حصہ ہے، وہ فطرت کے پورے نظام میں پائی جاتی ہے۔ اِس دنیا میں انسان کو جو کامیابی بھی ملتی ہے وہ اسی ترتیب کے اصول کے تحت ملتی ہے۔ اس دنیا کی کوئی بھی کامیابی ترتیب کے اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔

زراعت میں پہلے بونا ہوتا ہے اس کے بعد کاٹنا۔ باغبانی میں پہلے پَودا اُگانا ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کا پھل حاصل کرنا۔ لوہے کے ساتھ پہلے پگھلانا ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کو اسٹیل بنانا۔ غرض اس دنیا میں جتنی بھی چیزیں ہیں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ یہی ترتیب اور تدریج کا معاملہ ہوتا ہے۔ ہر چیز پہلے اپنے ابتدائی دَور سے گذرتی ہے اور پھر وہ اپنے انتہائی مرحلے تک پہنچتی ہے۔ فطرت کے اِس اصول میں کسی بھی چیز کا کوئی استثنا نہیں۔

یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان کو لذت کا لامحدود احساس دیا گیا ہے مگر لذتوں سے لامحدود طور پر تمتّع کرنے کا سامان موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا میں رکھ دیا گیا ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی اپنی لذت طلبی کی صلاحیت کو دریافت کرتا ہے اور اگلی دنیا میں وہ اپنی لذت طلبی کے مطابق، لذت کے تمام سامانوں کو حاصل کرے گا۔ موت سے پہلے کے مرحلۂ حیات میں لذت کا احساس،

اور موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں لذت سے تمتع۔

خالقِ کائنات نے اپنے تخلیقی نقشے کے مطابق، ایسا کیا ہے کہ موجودہ دنیا میں وہ انسان کو ممکن لذتوں کا ابتدائی تعارف کراتا ہے۔ اس طرح وہ انسان کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ اگر تم اِن لذتوں سے ابدی طور پر اور کامل طور پر متمتع ہونا چاہتے ہو تو اپنے اندر اس کا استحقاق پیدا کرو۔

یہ استحقاق کیا ہے۔ یہ استحقاق، ایک لفظ میں یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو پاکیزہ روح (purified soul) بنائے۔ وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے منفی احساسات سے پاک کرے۔ وہ اپنے آپ کو لالچ، خودغرضی، حسد، بددیانتی، جھوٹ، غصہ، انتقام، تشدّد اور نفرت جیسے تمام غیر انسانی جذبات کا شکار ہونے سے بچائے۔ وہ اپنے اندر وہ اعلیٰ انسانی شخصیت پیدا کرے جو مکمل طور پر مثبت شخصیت ہو۔ جو اپنے اعلیٰ اوصاف کے اعتبار سے اس قابل ہو کہ وہ خدا کے پڑوس میں رہ سکے۔ جو شیطانی انسان سے اوپر اٹھ کر ملکوتی انسان (Devine personality) بن جائے۔

انسان کی زندگی دو مرحلوں میں تقسیم ہے — موت سے پہلے، اور موت کے بعد۔ اس مرحلۂ حیات کا نسبتاً مختصر حصّہ موت سے پہلے کے دور میں رکھا گیا ہے۔ اور اس کا زیادہ طویل عرصہ موت کے بعد کے دَور میں۔ انسان کی کہانی کو اگر صرف موت سے پہلے کے مرحلۂ حیات کی نسبت سے دیکھا جائے تو وہ ایک المیہ (tragedy) نظر آئے گی۔ لیکن اگر انسان کی کہانی کو موت کے بعد کے مرحلۂ حیات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو وہ مکمل طور پر ایک (comedy) نظر آنے لگے گی۔

فطرت کے اس تخلیقی نقشہ (creation plan) کے مطابق، انسان ایک انتہائی نازک مقام پر کھڑا ہوا ہے۔ وہ ایک ایسے مقام پر ہے جہاں اس کو دو ممکن انتخابات میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے — موجودہ دنیا کے مواقع کو فطرت کے نقشے کے مطابق استعمال کرنا اور پھر ابدی لذتوں میں جینے کا مستحق بن جانا۔ یا موجودہ دنیا میں غفلت کی زندگی گذارنا، اور بعد کے دورِ حیات میں ابدی طور پر لذتوں سے محروم ہو جانا۔

جیسا بونا ویسا کاٹنا

انسان کی زندگی دو دوروں میں تقسیم ہے۔قبل از موت دور (pre-death period) اور بعد از موت دور (post-death period)۔موت سے پہلے کا محدود دور ٹسٹ کے لیے ہے اور موت کے بعد کا ابدی دور ٹسٹ کے مطابق اچھا یا بُرا انجام پانے کے لیے۔ٹسٹ میں پورا اترنے والوں کے لیے جنت ہے اور ٹسٹ میں فیل ہونے والوں کے لیے جہنم۔

خالق کے مطابق، یہی اس دنیا کے لیے تخلیق کا نقشہ ہے۔مگر جنت اور جہنم دونوں کی نوعیت یکساں نہیں۔تخلیق کا اصل مقصود اہلِ جنت ہیں۔ جہاں تک اہلِ جہنم کا تعلق ہے، وہ تخلیق کا صرف اضافی جزء ہیں، وہ اس کا حقیقی جزء نہیں۔اہل جہنم کا اصل رول یہ ہے کہ وہ اُس ماحول کو بناتے ہیں جس میں لوگوں کا ٹسٹ لیا جا سکے اور اس کے مطابق اہل جنت کا سلیکشن ہو سکے۔

موت سے پہلے کی دنیا ٹسٹ کے تقاضوں کے مطابق بنائی گئی ہے۔ٹسٹ کی مدت پوری ہونے کے بعد نہ اس دنیا کی ضرورت رہے گی اور نہ اس ٹسٹ میں فیل ہو جانے والوں کی۔اس مدت کے پورا ہونے کے بعد کائنات میں صرف جنت باقی رہے گی اور وہ لوگ جو جنت کی معیاری دنیا میں بسائے جانے کے لیے منتخب کئے گئے ہوں۔

اس تخلیقی اسکیم سے لوگوں کو باخبر کرنے کے لیے خالق نے مختلف انتظامات کئے ہیں۔ پہلا انتظام یہ کہ خود انسان کی فطرت میں اس کا گہرا شعور رکھ دیا گیا ہے۔ ہر انسان کا یہ تجربہ ہے کہ موجودہ دنیا میں اس کو کامل تسکین نہیں ملتی۔ یہاں نہ غریب آدمی اپنی مطلوب تسکین حاصل کرتا ہے اور نہ امیر آدمی۔ یہاں نہ کمزور آدمی کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور نہ طاقت ور آدمی کو۔ یہاں ہر آدمی بے تسکینی کی حالت میں جیتا ہے اور تھوڑے دنوں کے بعد اسی حال میں مر جاتا ہے۔ یہ عمومی بے تسکینی کی حالت ہر عورت اور مرد کو یاد دلاتی ہے کہ تمہاری منزل کوئی اور ہے۔تمہاری مطلوب دنیا قبل از موت دورِ حیات میں موجود نہیں۔اس لیے اس کو بعد از موت دور حیات میں حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

اس تخلیقی نقشے سے باخبر کرنے کے لیے خالق نے بہت سے انتظامات اس دنیا میں کیے ہیں۔ مثلاً موجودہ دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کوئی آرام کی زندگی نہ پا سکے۔ یہاں مسائل ہیں، یہاں بیماری ہے، یہاں حادثات ہیں، یہاں بورڈم ہے، یہاں طرح طرح کے نقصانات ہیں اور پھر تھوڑی مدت کے بعد اچانک مرجانا۔ اس طرح دنیا کے ناموافق حالات بار بار آدمی کو یہ یاددلاتے رہتے ہیں کہ تم اپنی مطلوب دنیا یہاں نہیں بنا سکتے۔ یہ دنیا تمہاری تمناؤں کی تکمیل کے لیے فیصلہ کن طور پر ناکافی ہے۔ یہ ناموافق صورت حال آدمی کو مسلسل حقیقت کی تلاش پر مجبور کرتی ہے۔

اسی طرح موجودہ دنیا میں بہت سے لوگ مصیبت (suffering) میں مبتلا ہوکر لوگوں کے لیے نمونۂ عبرت بن جاتے ہیں۔ ایک شخص مفلوج ہوکر وھیل چیئر پر جی رہا ہے، یا کسی لا علاج بیماری میں مبتلا ہوکر زندگی کی کشش کھودیتا ہے۔ اس طرح کے مختلف لوگ گویا خالق کی طرف سے نشان منزل (sign post) کا کام کررہے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ موجودہ دنیا کی زندگی کتنی بے حقیقت ہے۔ ایسے لوگ گویا خاموش زبان میں بتا رہے ہیں کہ انسان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ خود سے اپنی مرضی کی دنیا اپنے لیے بنا سکے۔

حالات کے کورس میں جن لوگوں کو اس طرح سائن پوسٹ کا رول ادا کرنے کا موقع ملے وہ لوگ اگر چہ بظاہر مصیبت میں دکھائی دیتے ہیں مگر ان کے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔ موت کے بعد آنے والے فیصلے کے دن ان سے چھوٹے عمل کو قبول کرلیا جائے گا۔ اپنی مصیبت کی بنا پر وہ جسمانی اعتبار سے اس قابل نہیں تھے کہ وہ کوئی بڑا عمل کرسکیں۔ اس بنا پر ان کے لیے صرف یہی کافی ہوجائے گا کہ وہ اپنے اس رول پر راضی ہوجائیں جو سائن پوسٹ کی حیثیت سے ان کے لیے مقدر ہوا تھا۔ وہ جس مصیبت میں مبتلا ہوئے ہیں اس پر صبر کرلیں۔ صبر اور رضا مندی ہی کی بنا پر کسی مزید عمل کے بغیر ان کو جنت میں داخلہ مل جائے گا۔

اِس حقیقت کا علم انسان کے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں۔ مختلف ذرائع سے یہ بات انسان کے علم میں آچکی ہے کہ وہ موت سے پہلے کے دَورِ حیات میں اپنی پسند کی دنیا نہیں بنا سکتا۔ یہاں جو کوئی اچھا

عمل کرے گا وہ بعد از موت دَورِ حیات میں اپنی پسند کی دنیا پا سکے گا۔ جنت اگلی دنیا میں بنے گی مگر جنّتی انسان آج ہی کی دُنیا میں بَن رہا ہے۔

جنت کیا ہے۔ موجودہ دنیا کو دیکھ کر جنت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دنیا ایک اعتبار سے گویا جنت کا تعارف ہے۔ یہ جنت کا ایک بہت چھوٹا نمونہ ہے۔ جنت دراصل موجودہ دنیا کا تکمیلی ایڈیشن ہے۔ موجودہ دنیا میں جو نعمتیں ہیں وہی تمام نعمتیں جنت میں بھی ہیں، فرق یہ ہے کہ موجودہ دنیا ناقص ہے اور جنت اس کے مقابلے میں کامل۔ موجودہ دنیا غیر معیاری ہے اور جنت کی دنیا معیاری۔ موجودہ دنیا فانی ہے اور جنت کی دنیا ابدی۔ موجودہ دنیا میں خوف اور حُزن ہے، یہاں شور اور تکلیف ہے جب کہ جنت وہ جگہ ہے جہاں نہ خوف ہوگا اور نہ حزن، جہاں نہ شور ہوگا اور نہ تکلیف۔ موجودہ دنیا محدودیت اور ڈس ایڈوانٹج سے بھری ہوگی۔ جب کہ جنت وہ جگہ ہے جہاں نہ محدودیت ہوگی اور نہ کسی قسم کا ڈس ایڈوانٹج۔ جنت میں انسان کو فل فلمنٹ (fulfilment) حاصل ہوگا جب کہ موجودہ دنیا میں کسی کو بھی فُل فِلمنٹ حاصل نہیں ہوتا۔

جہنم وہ جگہ ہے جو اِس کے بالکل بَرعکس ہوگی۔ جہنم کی دنیا میں وہ تمام تکلیفیں مزید اضافے کے ساتھ جمع کر دی جائیں گی جن کا تجربہ ہم موجودہ دنیا میں کرتے ہیں۔

موت سے پہلے کا دَور اور موت کے بعد کا دور، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔ دونوں کے درمیان وہی نسبت ہے جو بونے اور فصل کاٹنے میں ہوتی ہے۔ موت سے پہلے کا زمانہ گویا بونے کا زمانہ ہے، اور موت کے بعد کا زمانہ گویا فصل کاٹنے کا زمانہ۔ جیسا بونا ویسا کاٹنا، یہ ایک ابدی اُصول ہے۔ یہ اُصول بعد از موت دَورِ حیات پر بھی اتنا ہی منطبق ہوتا ہے جتنا کہ قبل از موت دَورِ حیات پَر۔

باب سوم

انسان اورحیوان

معلوم کائنات میں صرف انسان وہ مخلوق ہے جو ذہن (intelligence) رکھتا ہے۔ معلوم طور پر کوئی بھی دوسری مخلوق اس معاملے میں انسان کی شریک نہیں۔ حیوان بظاہر ایک زندہ مخلوق ہے۔ مگر حیوانات کی تمام سرگرمیاں اُن کی جِبِلَّت (instinct) سے کنٹرول ہوتی ہیں۔ جبلت کو سادہ زبان میں بےشعور ذہانت کہہ سکتے ہیں۔ باشعور ذہانت صرف انسان کی خصوصیت ہے کسی اور کی نہیں۔

جدید تحقیقات نے بتایا ہے کہ انسان کا ذہن لامحدود امکانات کا حامل ہے:

Human brain contains about hundred million billion billion particles.

انسان اپنی صلاحیت کے اعتبار سے لامحدود امکانات لے کر پیدا ہوتا ہے مگر تجربہ بتاتا ہے کہ ہر انسان اس احساس کے ساتھ مرتا ہے کہ وہ جو کچھ پانا چاہتا تھا اس کو وہ نہ پاسکا۔ فُل فِل مِنٹ (fulfilment) ہر انسان کی ایک گہری تمنا ہے۔ مگر ہر انسان فُل فِل منٹ کی منزل کو پائے بغیر مرجاتا ہے۔ یہ ایک ایسی ٹریجڈی ہے جو اس دنیا میں ہر عورت اور مرد کا مقدر بنی ہوئی ہے۔

اس دنیا میں بے شمار حیوانات ہیں۔ وہ بھی انسان کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں، مگر مذکورہ قسم کی عدم آسودگی کسی حیوان کا مسئلہ نہیں۔ ٹریجڈی کا لفظ صرف انسان کی ڈکشنری میں پایا جاتا ہے، وہ حیوان کی ڈکشنری میں موجود نہیں۔

انسان اور حیوان میں اس تضاد کا جواب ایک سادہ واقعے میں ملتا ہے۔ انسان اور حیوان کا تقابلی مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کے اندر استثنائی طور پر آئندہ کل (tomorrow) کا تصور پایا جاتا ہے۔ گویا انسان کی فطرت میں یہ شامل ہے کہ وہ اپنے آج کو کل تک وسیع کرنا چاہتا ہے، وہ اپنے آج میں جو کچھ نہ پاسکا اس کو وہ اپنے کل میں پانا چاہتا ہے۔

حیوانات کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ حیوانات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ آئندہ کل (tomorrow) کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔ وہ صرف آج میں جیتے ہیں اور آج ہی میں مرجاتے ہیں۔ حتیٰ

کہ حیوانات کا بعض کام جو بظاہر کل پر مبنی معلوم ہوتا ہے مثلاً، چیونٹی کا آئندہ موسم کے لیے خوراک جمع کرنا، وہ بھی جبلت کے تقاضے کے تحت ہوتا ہے نہ کہ کل یا مستقبل کے شعور کے تحت۔

انسان کی اس منفرد صفت کو لے کر جب غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا فُل فِل منٹ کے درجے کو پانے کا جذبہ کل کی نسبت سے ہے۔یعنی وہ کل حاصل ہونے والا ہے۔آج کا حیاتیاتی اسپین (span) بہت مختصر ہے، اس لیے اس کے حصول کو فطرت نے اس کو کل کے دورِ حیات میں رکھ دیا ہے۔

اس لحاظ سے انسان کی زندگی کے دو مرحلے ہیں، ایک قبل ازموت مرحلۂ حیات اور دوسرا بعد ازموت مرحلۂ حیات۔قبل ازموت مرحلۂ حیات عارضی ہے اور بعد ازموت مرحلۂ حیات ابدی۔یہ تقسیم اس لیے ہے کہ انسان جو کچھ آج نہ پا سکا اس کو وہ کل کے مرحلۂ حیات میں پا سکے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، انسانی دماغ (brain) کے اندر ایک سوملین، بلین بلین پارٹکل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسانی ذہن لامحدود پوٹینشیل رکھتا ہے۔یہ پوٹینشیل اتنا زیادہ ہے کہ انسان کی طبعی عمر جو لگ بھگ سو سال ہے، وہ اس پوٹینشیل کو کام میں لانے کے لیے بالکل ناکافی ہے۔حتیٰ کہ اگر انسان کی عمر اس سے بہت زیادہ ہو تب بھی زمین کے حالات اتنے محدود ہیں کہ اس محدود زمین پر انسان اپنے لامحدود ذہن کا استعمال نہیں پا سکتا۔انسانی ذہن کے لامحدود امکان کے مقابلے میں انسان کی عمر بھی ناکافی ہے اور موجودہ زمینی قیام گاہ کی عمر بھی ناکافی۔

اس حقیقت پر غور کیا جائے تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ انسان کو اپنے مکمل فُل فِل منٹ کے لیے ایک اور طویل تر عمر اور ایک اور زیادہ بڑی دنیا درکار ہے۔موجودہ حالت میں انسانی ذہن کے امکانات ہمیشہ غیر استعمال شدہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس حقیقت کو سامنے رکھ کر زندگی کی توجیہہ کی جائے تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ انسان کی زندگی آئس برگ کی مانند ہے۔اس آئس برگ کا بہت چھوٹا حصہ قبل ازموت مرحلۂ حیات میں نظر آتا ہے اور اس کا زیادہ بڑا حصہ بعد ازموت مرحلۂ حیات میں چھپا ہوا ہے۔یہ مانے بغیر انسانی

زندگی کی توجیہہ نہیں ہوتی اور جب کوئی تصور کسی مشاہدے کی توجیہہ کے لیے ایک ہی امکانی تصور بن جائے تو یہ اس بات کا علمی ثبوت ہوتا ہے کہ وہ تصور عین حقیقت ہے۔ یہی اس معاملے میں درست علمی موقف ہے۔

مذکورہ حقیقتوں کو سامنے رکھ کر انسانی زندگی کی توجیہہ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا انسان کی صرف عارضی قیام گاہ ہے۔ وہ اس کی ابدی منزل نہیں۔

ہر انسان لازمی طور پر موت سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ موت کیا ہے، موت دراصل ایک درمیانی پُل ہے۔ موت عارضی زندگی سے ابدی زندگی کی طرف منتقل ہونا ہے۔ موجودہ دنیا وہ دنیا ہے جہاں آدمی گویا اپنی تربیت کرتا ہے۔ موت سے پہلے کا مرحلۂ حیات گویا ایک ٹریننگ پیریڈ ہے۔ یہاں وقتی قیام کے دوران اپنے آپ کو تربیت یافتہ بنا کر اگلی مستقل دنیا میں جانا ہے، جہاں یہ موقع ملے گا کہ آدمی اپنے ذہن کے تمام امکانات کو استعمال کرے اور مکمل فُل فِل مینٹ کی خوشی حاصل کر سکے۔

تاہم دوسرے مرحلۂ حیات میں اُنھیں لوگوں کو جگہ ملے گی جنھوں نے پہلے مرحلۂ حیات میں اپنی باقاعدہ تربیت کی ہوگی۔ جو لوگ غیر تربیت یافتہ حالت میں وہاں پہنچیں گے وہ وہاں کے مواقع استعمال کرنے سے محروم رہ جائیں گے۔ وہ قبل از موت دورِ حیات میں بھی محروم رہیں گے اور وہ بعد از موت مرحلۂ حیات میں بھی فُل فِل مینٹ سے مکمل طور پر محروم رہیں گے۔ یہ محرومی بلاشبہہ ان کے لیے ایک ایسی سزا ہوگی جس سے زیادہ سخت سزا کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

انسان اگر صرف اپنے آج میں جیئے اور اپنے آج میں مَر جائے تو وہ گویا حیوان کی زندگی جِیا اور حیوان کی زندگی مر گیا۔ حقیقی انسان وہ ہے جو اپنے آج سے گذر کر اپنے کل تک پہنچ جائے۔ جو اپنی محدود دنیوی عمر کو ختم کر کے اس طرح مرے کہ اس میں اپنے کل کی تعمیر کر لی ہو، وہی حقیقت میں انسان ہے اور وہی اس قابل ہے کہ اس کو کامیاب انسان کا ٹائٹل دیا جائے۔

انسان کی منزل

ڈاکٹر الکسس کیرل (Alexis Carrel) ۱۸۷۳ میں فرانس میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ سائنسی تعلیم کے بعد انھوں نے اپنے کیریر کا بیشتر حصہ امریکا میں گزارا۔ ۱۹۱۲ میں ان کو میڈیسن کا نوبل پرائز ملا۔ ۱۹۴۴ میں ان کا انتقال ہوا اور فرانس میں ان کے وطن میں ان کی تدفین ہوئی۔

ڈاکٹر الکسس کیرل کی ایک کتاب ۱۹۳۵ میں انسان نامعلوم (Man The Unknown) کے نام سے چھپی۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے۔ اس کتاب کے بارے میں اس کے ایک تبصرہ نگار نے درست طور پر لکھا ہے کہ: یہ کتاب خالص سائنسی اعتبار سے انسان اور اس کی زندگی کے بارے میں مصنف کے تجربات کا خلاصہ پیش کرتی ہے:

> This book sums up much of his experience of man
> and his life seen from the purely scientific aspect.

۳۱۲ صفحے کی اس کتاب میں ڈاکٹر الکسس کیرل انسانی زندگی کی حقیقت معلوم کرنے میں ناکام رہے۔ چنانچہ اپنی اس کتاب کا ٹائٹل انھوں نے ان الفاظ میں مقرر کیا — انسان نامعلوم (Man The Unknown)

اس کتاب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جہاں تک انسان بحیثیت ایک سائنسی وجود کا معاملہ ہے اس کو ڈاکٹر الکسس کیرل بڑی حد تک دریافت کر چکے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی کتاب کا نام انسان نامعلوم کیوں رکھا۔ ایسا ایک کنفیوژن کی بنا پر ہوا۔ الکسس کیرل نے ''انسان'' کو تو معلوم کرلیا تھا مگر ان کا مطالعہ ان کو یہ نہ بتا سکا کہ اس انسان کی منزل کیا ہے۔ ان کو محسوس ہوا کہ ایک معلوم انسان ایک غیر معلوم منزل کی طرف جا رہا ہے۔ اور یہی ان کی عدم معرفت کا اصل سبب ہے۔ اس اعتبار سے کتاب کا زیادہ صحیح ٹائٹل یہ ہوگا — نامعلوم منزل (Goal The Unknown)

یہ صرف ڈاکٹر الکسس کیرل کا مسئلہ نہیں۔ یہی تمام فلاسفہ اور مفکرین کا مسئلہ ہے۔ انسان

بظاہر ان کے لیے ایک معلوم چیز تھی۔ مگر اس معلوم انسان کی منزل کیا ہے، وہ ان کے لیے آخری حد تک غیر معلوم رہی۔ انسان اور اس کی منزل کے درمیان یہی فکری خلا ہے جو ہزاروں سال سے انسان کو سرگرداں کئے ہوئے ہے۔ مگر آخر میں کنفیوژن کے سوا کسی کو کچھ نہیں ملا۔ یہ ایک لائف ڈیفائننگ (life defining) سوال ہے اور اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس کا تشفی بخش جواب دریافت کیا جائے۔

اصل یہ ہے کہ یہ فلاسفہ اور مفکرین انسان کی منزل اِسی آج کی دنیا میں ڈھونڈھ رہے ہیں۔ جب کہ آج کی دنیا میں وہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ یہ دنیا ایک نامکمل دنیا ہے، جب کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک مکمل دنیا کا طالب ہے۔ انسان حیاتِ ابدی چاہتا ہے، جب کہ موت سے پہلے کی اس دنیا میں حیات ابدی کسی کے لیے ممکن ہی نہیں۔ انسان مسرتوں کی دنیا چاہتا ہے مگر اِس دنیا میں طرح طرح کے ناموافق حالات ہیں جو اس دنیا کو پُرمسرت دنیا بنانے میں لازمی رکاوٹ ہیں۔ انسان آئیڈیل دنیا چاہتا ہے مگر یہاں وہ ایک غیر آئیڈیل دنیا میں رہنے پر مجبور ہے۔ انسان پیدائشی طور پر پرفیکشنسٹ (perfectionist) ہے۔ وہ ایک پرفیکٹ دنیا چاہتا ہے مگر ساری کوششوں کے بعد وہ صرف یہ دریافت کرتا ہے کہ یہاں پرفکٹ دنیا کا ملنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو چیز غیر معلوم ہے وہ انسان نہیں ہے۔ غیر معلوم چیز دراصل انسان کی منزل ہے۔ دوسرے لفظوں میں، وہ دنیا جو انسان کے خوابوں کی تعبیر ہو، جو ہر قسم کے تضاد سے خالی ہو، جہاں انسان پورے فُل فِلمنٹ (fulfilment) کے ساتھ ہمیشہ کے لیے جی سکے۔

یہ بظاہر ناقابلِ حل مسئلہ اس وقت واضح طور پر حل ہو جاتا ہے جب کہ انسان کا مطالعہ خدائی اسکیم کی روشنی میں کیا جائے۔ یعنی مخلوق کو سمجھنے کے ساتھ خالق کی منشا کو بھی سمجھا جائے۔ یہی اس معاملے میں سائنٹفک طریقہ ہے۔ جب اِس حیثیت سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا مسئلہ صرف اس لیے ہے کہ خدا کے کریشن پلان (creation plan) کو سامنے رکھے بغیر انسان کو سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

انسان ایک مخلوق ہے، وہ خود خالق نہیں، جس طرح مشین ایک مصنوع (make) ہے، وہ خود

اپنی صانع (maker) نہیں۔ ایسی حالت میں انسان کی حقیقت کو جاننے کے لیے خالق کے تخلیقی نقشے کو جاننا ضروری ہے۔ انجینئر کے منصوبے کو جانے بغیر مشین کی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح خالق کے تخلیقی نقشے کو جانے بغیر انسان کی توجیہہ کرنا ممکن نہیں۔ اس تخلیقی نقشے کو سامنے رکھے بغیر انسان کی زندگی اور اس کی معنویت ناقابل فہم رہتی ہے۔ لیکن اس تخلیقی نقشے کو سمجھنے کے بعد ہر چیز پوری طرح قابل فہم بن جاتی ہے۔ ہر چیز اپنا صحیح مقام پالیتی ہے:

Everything falls into place.

اصل یہ ہے کہ اس دنیا کو بنانے والے نے اپنے تخلیقی نقشے کے مطابق، اُس کو ایک جوڑا دنیا (pair world) کی شکل میں بنایا ہے۔ ایک وہ دنیا جس میں ہم پیدا ہونے کے بعد رہتے ہیں۔ دوسری وہ دنیا جہاں ہم موت کے بعد چلے جاتے ہیں۔ اس طرح انسانی زندگی کے دو حصے ہیں، ایک قبل از موت پیریڈ (pre-death period) اور دوسرا بعد از موت پیریڈ (post-death period)۔ انسانوں کو اُس کے پیدا کرنے والے نے ایک ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ مگر اُس نے اس کی زندگی کو دو مرحلوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ قبل از موت دور اور بَعد از موت دور۔

موت سے پہلے کی دنیا آزمائشی مقام (testing ground) کے طور پر بنائی گئی ہے اور موت کے بعد کی دنیا دارُالجزاء (world of reward) کے طور پر۔ موجودہ دنیا چونکہ ٹسٹ کے لیے بنائی گئی ہے اس لیے یہاں ہر ایک کو آزادی حاصل ہے۔ یہاں ہر چیز ناقص اور محدود صورت میں ہے۔ گویا کہ موجودہ دنیا ایک قسم کا اگزامینیشن ہال (examination hall) ہے۔ یہاں ٹسٹ دینے کے بقدر ضروری سامان موجود ہیں مگر پُرمسرت زندگی گزارنے کے لیے جو اعلیٰ چیزیں درکار ہیں وہ یہاں موجود نہیں۔ اگزامنیشن ہال کے اندر کوئی طالب علم اپنی مطلوب زندگی کی تعمیر کرنا چاہے تو اس کو صرف مایوسی ہوگی۔ یہی مایوسی ان لوگوں کو ہورہی ہے جو موجودہ ٹسٹ کی دنیا میں اپنے مطلوب مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

قبل از موت دنیا میں کسی عورت یا مرد کو کیا کرنا ہے کہ وہ بعد از موت دنیا میں اپنی مطلوب دنیا (desired world) پاسکے، اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنی آزادی کو خالق کی منشا کے مطابق استعمال کرے۔

بعد از موت زندگی کے لیے خدا نے ایک مکمل دنیا بنائی ہے جس کا نام جنت ہے۔ یہ جنت ہر اعتبار سے آئیڈیل اور پرفکٹ ہے۔ اس جنت میں بسانے کے لیے خدا کو ایسے انسان درکار ہیں جو جنت کی اس دنیا میں بسائے جانے کے اہل ہوں۔ موجودہ دنیا میں جو آدمی اپنے آپ کو خدائی معیار کے مطابق کوالیفائی (qualify) کرے گا وہ جنت کی معیاری دنیا میں بسایا جائے گا۔

یہ کوالیفائڈ عورت اور مرد کون ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے خدا کی معرفت حاصل کریں۔ جو فکری کنفیوژن سے باہر آکر سچائی کو دریافت کریں۔ جو غیر خدا کی پرستش کو چھوڑ کر خدا کے پَرستار بنیں۔ جو آزادی کے باوجود اپنے آپ کو خدائی ڈسپلن میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ جو منفی حالات میں اپنے اندر مثبت شخصیت کی تعمیر کریں۔ جو دوسروں کے ساتھ بھی وہی اخلاقی معاملہ کریں جو وہ اپنے ساتھ چاہتے تھے۔

خدا کے کریشن پلان کے مطابق، یہی معیار (criterion) ہے۔ جو عورت یا مرد اس معیار پر پورے اتریں وہ موت کے بعد ابدی جنت میں بسائے جائیں گے۔ اور جو لوگ اِس معیار پر پورے نہ اتریں وہ موت کے بعد ابدی جہنم (hell) میں ڈال دئے جائیں گے جہاں ان کے لیے حسرت اور مایوسی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ اہلِ جنت کا کیس ان لوگوں کا کیس ہے جنھوں نے آج کی دنیا کے مواقع (opportunities) کو استعمال (avail) کیا اور اہلِ جہنم کا کیس ان لوگوں کا کیس ہے جو موجودہ دنیا کے مواقع کو استعمال (avail) نہ کر سکے۔ ان کا کیس محروم مواقع (missed opportunities) کا کیس قرار پائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ کوئی موقع صرف ایک بار تمہارا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ ابدی کامیابی کے معاملے میں یہ قول پوری طرح درست ہے۔ کیوں کہ یہ موقع کسی کو بھی دوسری بار ملنے والا نہیں۔ جن لوگوں کا کیس مواقع کو استعمال کرنے والے (opportunities availed) کا کیس قرار پائے گا وہ بھی ہمیشہ کے لیے ہوگا اور جن لوگوں کا کیس مواقع کو کھونے والے (opportunities missed) کا کیس ہوگا وہ بھی ہمیشہ کے لیے ہوگا۔ اِس معاملے میں ہر ایک کے لیے ناکامی بھی ابدی ہوگی اور کامیابی بھی ابدی۔

خدااور انسان

انتھراپالوجی ایک ڈسپلن ہے۔ اس ڈسپلن کے تحت انسان کی اسٹڈی کی جاتی ہے۔ انتھراپالوجی کے تحت قدیم ترین معلوم زمانے سے لے کر اب تک کی تفصیلی اسٹڈی کی گئی ہے۔ اِس اسٹڈی کے ذریعے جو باتیں معلوم ہوئی ہیں ان میں سے ایک اہم بات یہ ہے کہ خدا کا تصور انسان کی فطرت میں نہایت گہرائی کے ساتھ پیوست ہے۔ ہر عورت اور ہر مرد پیدائشی طور پر خدا کے تصور کو لے کر اس دنیا میں آتے ہیں۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر مجبور ہیں کہ اِس تصور کے ساتھ زندگی گزاریں۔

مزید مطالعہ بتاتا ہے کہ خدا انسان کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ انسان ایک توجیہہ طلب حیوان (explanation seeking animal) ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے وجود اور اپنے اردگرد کی دنیا کی توجیہہ کرے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کو مانے بغیر اس کی توجیہہ ممکن نہیں۔ اسی طرح انسان اپنی محدودیت کی بنا پر اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کرتا ہے۔ اِس احساس کی تلافی بھی صرف خدا جیسی ایک ہستی کو جاننے سے ہوتی ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ہر انسان ناتمام خواہشوں (unfulfilled desires) میں جیتا ہے۔ یہ صرف خدا ہے جس کے ذریعے اس کو تکمیل کی امید ہوسکتی ہے۔ انسان اپنے مخصوص نیچر کی بنا پر یقین (conviction) میں جینا چاہتا ہے۔ اس یقین کا سورس بھی خدا کے سوا اور کوئی نہیں۔

انسان کو اپنی سرگرمیوں کے لیے ایک نشانہ درکار ہے تاکہ وہ مطمئن ہو کر اس کی طرف اپنا سفر جاری رکھے۔ یہ نشانہ بھی اس کو صرف خدا کے عقیدے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ دنیا کے تمام عورت اور مرد کسی نہ کسی طور پر خدا کو مانتے ہیں۔ حتیٰ کہ بظاہر منکرِ خدا (atheist) لوگوں کا بھی یہ حال ہے کہ جب ان پر کوئی کرائسس (crisis) آتا ہے تو وہ بے اختیارانہ طور پر خدا کو پکار اٹھتے ہیں۔ معلوم طور پر اِس معاملے میں کسی بھی عورت یا مرد کا کوئی استثناء نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جب ہر شخص خدا میں عقیدہ رکھتا ہے تو اس کو وہ نتیجہ کیوں نہیں ملتا جو خدا میں عقیدہ رکھنے کی صورت میں ملنا چاہیے۔ خدا کو مانتے ہوئے بھی ہر انسان کا یہ حال ہے کہ وہ ربّانی احساس (divine inspiration) سے محروم ہے۔ اس کو ذہنی سکون (peace of mind) حاصل نہیں۔ ہم خدا پر یقین رکھتے ہیں (We trust in God) کا بورڈ لگانے والے بھی حقیقی معنوں میں گاڈ میں ٹرسٹ کرنے کی نعمت سے محروم ہیں۔ لوگ خدا کو مانتے ہیں مگر وہ محسوس کرتے ہیں کہ خدا کے ساتھ ان کا ربط (communion) قائم نہیں ہوتا۔ خدا کو ماننے کے باوجود لوگوں کی زندگیوں میں خدا کی رحمت (blessing) کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ لوگ خدا کے نام پر غیر خدا سے اپنے آپ کو وابستہ (associate) کیے رہتے ہیں۔ زبان سے وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کو مانتے ہیں مگر عملاً وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی غیر خدا کے ساتھ وابستہ کیے ہوئے رہتے ہیں۔

کوئی کسی زندہ یا مردہ انسان کو خدا کی جگہ بٹھائے ہوئے ہے۔ کوئی سورج دیوتا (Sun god) اور چاند دیوتا (Moon god) جیسے خداؤں میں اٹکا ہوا ہے۔ کوئی ہیومنزم کے نام پر وہ کر رہا ہے جس کو — عہدے کا خدا سے انسان کی طرف منتقل ہونا کہا جاتا ہے:

Transfer of seat from God to Man

کوئی قانونِ فطرت (law of nature) کو خدا کا بدَل سمجھے ہوئے ہے۔ اِسی طرح کچھ لوگ مانسٹِک (monistic) تصورِ خدا کو لیے ہوئے ہیں۔ جس میں خدا ایک vague اسپرٹ ہوتا ہے نہ کہ کوئی مستقل وجود جس سے ربط قائم کیا جا سکے، وغیرہ۔

اگر آپ اپنے ٹیلی فون پر کسی نمبر کو ڈائل کریں اور اتفاق سے غلط نمبر ڈائل ہو جائے تو دوسری طرف سے یہ آواز آئے گی کہ یہ نمبر موجود نہیں: (This number does not exist)۔ یہی آج لوگوں کا حال ہے۔ وہ خدا کے نام پر ایسی ہستیوں کو پکار رہے ہیں جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں۔

اِس لیےان کی ہر پکار کا جواب یہ آ رہا ہے کہ یہ خدا موجود نہیں (This god does not exist)۔

اِس مسئلے کا حل یہ ہے کہ ہر آدمی اس پورے معاملے کا ازسرِ نو جائزہ لے۔ اگر وہ اس معاملے میں سنجیدہ ہوگا تو یقینی طور پر وہ اِس نتیجے پر پہنچے گا کہ اس کو اُس سسٹم آف تھاٹ کو دریافت کرنا ہے جس میں خدا کا تصور اپنی خالص صورت میں آدمی کو مل جائے۔ یہ ہر عورت اور مرد کا مسئلہ ہے۔ ہر عورت اور مرد اعتقادی طور پر کسی نہ کسی خدا کو اپنا خدا بنائے ہوئے ہے۔ مگر خدا کو ماننے کے جو نتائج ہیں وہ اس کو حاصل نہیں۔ ہر انسان اپنے ذاتی تجربے کے تحت یہ محسوس کرسکتا ہے کہ اس کے لیے مسئلے خدا پر عقیدہ نہ رکھنے (lack of belief in God) کا نہیں ہے بلکہ عقیدۂ خدا کا نتیجہ نہ ملنے (lack of result of belief in God) کا مسئلہ ہے۔ یہ ایک ایسی یونیورسل حقیقت ہے جس کو ہر آدمی اپنے ذاتی تجربے کے تحت جان سکتا ہے۔

عقیدہ اور نتیجۂ عقیدہ کے درمیان اِس فرق کا ممکن سبب صرف ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ اس نے خدا کے نام پر کسی غیر خدا پر اپنا عقیدہ بنا رکھا ہو۔ ایسی حالت میں فطری طور پر یہ ہوگا کہ عقیدے کے باوجود آدمی کو عقیدے کا نتیجہ حاصل نہیں ہوگا۔

بہت سے اسکالرس نے اس مسئلے پر ریسرچ کی ہے اور اس کا جواب معلوم کیا ہے۔ ان ہی میں سے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ بنگالی ڈاکٹر نشی کانت چٹو پادھیائے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۰۴ میں حیدرآباد دکن میں ایک مطبوعہ لکچر میں اپنا دریافت کردہ جواب بتایا تھا۔ وہ یہ کہ ”اِس معاملے میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی سے پہلے جو مذاہب دنیا میں آئے وہ اگر چہ اعتقادی طور پر ایک ہی خدا کو ماننے والے تھے مگر بعد کے زمانے میں ان کا اوریجنل ٹکسٹ محفوظ نہ رہ سکا۔ ہر مذہب کے ساتھ یہ ہوا کہ اس میں خدا کا تصور تبدیلی کا شکار ہوگیا اور خدا کے معاملے میں ان مذاہب کی اوریجنل تعلیم محفوظ نہ رہ سکی۔

ساتویں صدی کے رُبع اول میں اسلام کا ظہور ہوا۔ اسلام بھی اگر چہ دوسرے مذاہب کی طرح ایک مذہب تھا لیکن اسلام کی امتیازی صفت یہ ہے کہ اس کا اوریجنل ٹکسٹ پوری طرح محفوظ رہا۔ اس لیے اب بعد کی جنریشن کے لیے خدا کے درست عقیدے کو جاننے کا معتبر ماخذ صرف اسلام رہ گیا ہے۔

جو آدمی اس معاملہ میں سنجیدہ ہو اور خدا کے معاملے میں درست عقیدے کو جاننا چاہے اس کے لیے اب اسلام کے سوا کوئی دوسرا انتخاب (choice) موجود نہیں‘‘۔

قرآن واحد محفوظ کتاب ہے۔ قرآن کے مطابق، خدا ایک ہے۔ وہی انسان اور کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ وہ پورے عالم کا قیّوم (Sustainer) ہے۔ خدا ایک زندہ ہستی ہے۔ وہ دیکھنے اور سننے والا ہے۔ ہر لمحہ اور ہر جگہ انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ خدا سے براہِ راست کنٹیکٹ کر سکے۔ خدا اپنی بے پناہ طاقتوں کے ساتھ انسان کی ہر کمی کی تلافی کرنے والا ہے۔ خدا قبل از موت دَور (pre-death period) اور بعد از موت دَور (post-death period) دونوں مرحلے میں انسان کا مددگار ہے۔ خدا انسان کے لیے پیس اور سکون کا اتھاہ خزانہ ہے۔ خدا ہر معاملے میں انسان کو اپنے پیغمبروں کے ذریعے ہدایت فراہم کرتا ہے۔

خدا کی صفت یہ ہے کہ وہ انسان کا خالق (Creator) اور اس کا قیوم (Sustainer) ہے۔ اِس بنا پر ایسا ہے کہ خدا انسان کی ماہیت کو پوری طرح جانتا ہے۔ وہ انسان کی ضرورتوں سے آخری حد تک باخبر ہے۔ اِس بنا پر خدا ہی اِس قابل ہے کہ وہ انسان کے معاملے کو سمجھے اور اُس کو وہ سب کچھ دے سکے جس کی انسان کو ضرورت ہے۔ یہی اکیلا خدا انسان کا خدا بن سکتا ہے۔ اس کے سوا کسی مفروضہ ہستی کو یہ طاقت حاصل نہیں کہ وہ انسان کی اس ضرورت کو پورا کر سکے جس کو خدا کہا گیا ہے۔

قرآن اسی خدا کا مستند تعارف ہے۔ قرآن واحد ماخذ ہے جس کے ذریعے کوئی شخص خدا کے بارے میں قابلِ اعتماد تعارف حاصل کر سکے۔

مِلّینز اور ملینز انسانوں نے اپنے ذاتی تجربے کے تحت اِس بات کی گواہی دی ہے کہ انھوں نے قرآن کا مطالعہ کیا اور اس میں انھوں نے خدا کا وہ تعارف حاصل کیا جو ان کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔ انھوں نے اِس بات کا اقرار کیا ہے کہ خدا کے دوسرے تصورات ان کی اندرونی طلب کا جواب نہیں بن رہے تھے۔ مگر جب انھوں نے قرآن میں دیے ہوئے تصورِ خدا کو جانا تو ان کا دل پکار اٹھا کہ

یہی ان کا وہ مطلوب خدا ہے جس میں ان کی شخصیت کے لیے کامل fulfilment موجود ہے۔

ہر زمانے کا انسان اپنی فطرت کے تحت خدا کا طالب تھا۔ ہر زمانے کے مذاہب انسان کو اس کی طلب کے مطابق خدا کا علم دیتے رہے۔ مگر قدیم زمانے میں کتابوں کے لکھنے اور اس کو محفوظ رکھنے کا بے خطا نظام نہیں بنا تھا۔ اِس لیے یہ مذہبی کتابیں اپنی اصل حالت میں محفوظ نہ رہیں۔ آخر کار ساتویں صدی کے آغاز میں قرآن کا ظہور ہوا۔ مخصوص اہتمام کی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ قرآن اپنی اوریجنل صورت میں مکمل طور پر محفوظ ہو جائے۔ اب جو شخص بھی اپنی زندگی کی تعمیر کا طالب ہو وہ قرآن کا مطالعہ کر کے اس خدا کو دریافت کرسکتا ہے جس کے بغیر کسی انسان کے لیے اپنے مستقبل کی حقیقی تعمیر ممکن نہیں۔

انسان کا اَلمیہ

فطرت کے قانون کے مطابق، انسان کو ایسے حالات میں پیدا کیا گیا ہے کہ اس کو اپنی پوری زندگی مشقتوں میں گزارنی پڑے۔ اس کے مطابق، مشقت اور رنج خالق کے تخلیقی منصوبے کا ایک لازمی حصہ ہے۔ کوئی بھی انسان اس پر قادر نہیں کہ وہ اپنے آپ کو زندگی کے اِس پُر مشقت کورس سے بچا سکے۔

دنیا کی زندگی میں رنج ومشقت خالق کے تخلیقی منصوبے کا حصہ ہیں۔ یہ نظام اس لیے ہے کہ آدمی کو یاد دلایا جائے کہ موجودہ دنیا تمہارے لیے عیش گاہ کے طور پر نہیں بنائی گئی بلکہ وہ امتحان گاہ کے طور پر بنائی گئی ہے۔ موجودہ دنیا اس لیے ہے تاکہ آدمی مختلف احوال سے گزرے۔ انھیں احوال کے درمیان یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص جنت کی ابدی دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہے یا نہیں۔ جو شخص ان احوال کے دوران صحیح اور مطلوب ردعمل نہ پیش کرے وہ اِس قابل ہے کہ اس کو الگ کرکے جہنم کے کوڑے خانے میں ڈال دیا جائے۔

موجودہ ترقی یافتہ دنیا میں بھی مَشقّت (toil) کی یہ صورتِ حال بدستور باقی ہے۔ لیکن خدا کے تخلیقی نقشے سے بے خبری کی بنا پر لوگ اس کی نوعیت کو سمجھ نہیں پاتے اور غلط ردعمل پیش کرکے اپنے آپ کو خدا کی نظر میں ایسا انسان ثابت کرتے ہیں جو امتحان کے کورس سے گزرا مگر وہ اپنے آپ کو کامیاب نہ کرسکا۔

موجودہ زمانے میں اس مسئلے کو لے کر بڑے بڑے ادارے کھلے ہیں جو اپنے دعوے کے مطابق، ڈی اسٹریسنگ (de-stressing) کا کام کرتے ہیں۔ یعنی دماغی سوچ کو معطّل کرکے آدمی کو سکون عطا کرنا۔ مگر یہ ایک قسم کا وقتی عملِ تخدیر (anaesthesia) ہے، نہ کہ مسئلے کا کوئی حقیقی حل۔ اِس مسئلے کا حقیقی حل صرف ایک ہے، اور وہ ہے اسٹریس مینیجمنٹ (stress management)۔

یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی میں مصیبت کا شکار رہتے ہیں وہ اکثر اپنے آپ کو اُس چیز میں مشغول کرلیتے ہیں جس کو انسانی خدمت یا سوشل سروس کہا جاتا ہے۔ یہ گویا غم غلط کرنے کی

ایک تدبیر ہے مگر وہ بھی ''مشقت'' کی صورت حال کا صحیح اور مطلوب ردعمل نہیں۔

سوشل سروس ایک انسانی خدمت ہے اور اس اعتبار سے وہ بلاشبہہ ایک قابل تعریف عمل ہے۔ مگر زندگی کے بارے میں فطرت کے تخلیقی نقشے کی اہم تر نسبت سے دیکھا جائے تو اس کے اندر ایک غیر مطلوب پہلو چھپا ہوا ہے۔ غور کیجئے کہ جو شخص کسی مصیبت کا تجربہ کرتا ہے اور پھر وہ سوشل سروس میں مشغول ہو جاتا ہے، اس کی نفسیات کیا ہوتی ہے۔ اس کی نفسیات ایک جملے میں یہ ہوتی ہے کہ — جو کچھ میں نے بھگتا وہ دوسروں کو نہ بھگتنا پڑے:

Let no other suffer what I have suffered.

یہ نفسیات بتاتی ہے کہ آدمی سارے معاملے کو بس دنیا کا معاملہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک مصیبت صرف دنیا کی مصیبت ہے اور سب سے بڑا کام یہ ہے کہ دنیا کو بے مصیبت جگہ بنایا جائے۔ حالاں کہ یہ سوچ فطرت کے تخلیقی نقشے کے خلاف ہے، اس لیے وہ یہاں واقعہ بننے والی ہی نہیں۔

جب بھی دنیا میں کسی کو کوئی ناخوشگوار تجربہ ہو تو وہ اس لیے ہوتا ہے کہ آدمی اس سے صحیح سبق لے۔ وہ اس حقیقت کو یاد کرے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں کسی کو بھی آرام کی زندگی ملنے والی نہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ دنیا کے منفی تجربات سے سبق لے۔ وہ اپنے اندر اس شعور کو جگائے کہ اس محدود دنیا میں مجھے اپنی مطلوب زندگی ملنے والی نہیں۔ مجھے اپنی مطلوب زندگی اگلے دَورِ حیات کی لامحدود دنیا میں تلاش کرنی چاہیے۔

ایسی حالت میں ناخوشگوار تجربات کا صحیح سبق یہ ہے کہ آدمی اگلی دنیا کی جنت کو یاد کرے، وہ اپنے اندر اس سوچ کو بیدار کرے کہ — جو کچھ میں نے آج کی عارضی دنیا میں بھگتا وہ مجھے کل کی ابدی دنیا میں نہ بھگتنا پڑے:

Let me not suffer in the Hereafter that
which I have suffered in this world.

کامیاب وہ ہے جس نے عارضی دنیا میں ابدی دنیا کو پہچانا۔ جس نے موجودہ دنیا کی ناکامی میں اگلے دورِ حیات کی ابدی کامیابی کا راز دریافت کرلیا۔

خدا نے موجودہ دنیا کو ایک ایسے نقشے کے مطابق بنایا ہے کہ یہاں ہر انسان ''مشقت'' میں رہے۔ دوسری طرف یہ ایک حقیقت ہے کہ موت کے بعد آنے والی دوسری دنیا غم سے پاک ہوگی جو صرف خدا کے پسندیدہ لوگوں کو ملے گی۔ زندگی کے بارے میں یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مذکورہ قسم کے تمام مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

اس تخلیقی تقسیم کی روشنی میں دیکھئے تو تمام انسانی مسائل کی جڑ یہ ہے کہ لوگ موت سے پہلے کی دنیا میں اپنی جنت بنانا چاہتے ہیں جب کہ یہاں فطرت کے نظام کے تحت، وہ حالات ہی موجود نہیں کہ کوئی شخص یہاں اپنی جنت بنا سکے۔ جس طرح ریت یا دلدل کے اوپر کوئی عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی ہے اسی طرح موجودہ دنیا میں کسی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ یہاں اپنا عیش محل تعمیر کر سکے۔ اور جب فطری قانون کے تحت، آدمی اس ناکامی سے دوچار ہوتا ہے تو وہ مختلف قسم کے منفی ردِّعمل کا شکار ہو کر اپنے کو مزید تباہی میں ڈال لیتا ہے۔

صحیح یہ ہے کہ آدمی اس تخلیقی قانون کا اعتراف کرے اور اس کے مطابق، وہ اپنی زندگی کا منصوبہ بنائے۔ یہ منصوبہ صرف ایک ہے — موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو وہ مطلوب انسان بنانا جو موت کے بعد کی دنیا میں جنت میں داخلے کا مستحق قرار پائے۔ فطرت کے تخلیقی نقشے کے مطابق، موت سے پہلے کی دنیا میں انسان کے لیے قناعت ہے، اور موت کے بعد کی دنیا میں انسان کے لیے جنت۔ دَورِ قناعت میں جنت نہیں، اور دَورِ جنت میں قناعت نہیں۔

بھلاوہ کلچر

موجودہ زمانے میں جو ترقی یافتہ کلچر ساری دنیا میں رائج ہوا ہے اس کے مختلف نام دیے جاتے ہیں—ماڈرن کلچر، کنزیومر کلچر، مٹیریل کلچر، انٹرٹینمنٹ کلچر، سیکولر کلچر، ویسٹرن کلچرل وغیرہ۔ مگر زیادہ صحیح طور پر اس کا نام صرف ایک ہے اور وہ ہے بھلاوہ کلچر۔

اس کلچر نے موجودہ زمانے میں پہلی بار یہ کیا ہے کہ بہت بڑے پیمانے پر انسان کو بھلاوہ میں ڈال دیا ہے۔ آج کا انسان مختلف قسم کی نئی نئی چیزوں میں مشغول رہتا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی میں وہ موقع ہی نہیں آتا کہ وہ حقیقتِ اعلیٰ کے بارے میں سوچ سکے۔

قدیم زمانے میں انسان کے پاس بہت سے ایسے لمحات ہوتے تھے جب کہ وہ مشغولیت سے خالی ہوتا تھا۔ ان خالی اوقات کو وہ معنویت کی تلاش میں گزارتا تھا۔ وہ اشیاء کی حقیقت پر غور کرتا تھا۔ وہ کوشش کرتا تھا کہ ظاہری دنیا کے پیچھے جو اعلیٰ حقیقت ہے اس کو سمجھ سکے۔ مگر موجودہ زمانے کی مصنوعی سرگرمیوں نے انسان کو اپنی طرف اتنا زیادہ کھینچ لیا ہے کہ کسی کے پاس بھی اب زیادہ بامعنی سوالات پر غور کرنے کا وقت نہیں۔

انسانی زندگی کے بارے میں ایک سوال یہ ہے کہ مادی ضرورتوں کی تکمیل کس طرح کی جائے۔ پچھلے زمانے میں یہ سوال ایک سادہ سوال کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ زندگی کی ضرورت کو فراہم کیا جا سکے۔ مگر جدید کلچر نے اس مسئلے کو بہت زیادہ بڑھایا۔ پہلے یہ سوال تھا کہ زندگی کے لیے سہولتیں کس طرح حاصل کی جائیں۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر یہ سوال توجہ کا اصل مرکز بن گیا کہ زندگی کے عیش (luxuries) کو کس طرح فراہم کیا جائے۔ مزید آگے بڑھ کر یہ سوال یہاں تک پہنچا کہ زندگی کو کس طرح زیادہ سے زیادہ پرلطف بنایا جائے۔ انسانی خواہشوں کو کس طرح زیادہ سے زیادہ پورا کیا جائے۔ یہاں پہنچ کر انسان نے اپنی پوری زندگی صرف راحت کے مادی سامانوں کی فراہمی میں لگا دی۔ اس کے پاس اس کا وقت ہی نہ رہا کہ وہ زندگی کو زیادہ بامعنیٰ بنانے کے لیے سوچے یا وہ

اس کے لیے کچھ کرے۔ یہی وہ صورت حال ہے جس کی بنا پر ہم نے موجودہ کلچر کو بھلاوہ کلچر کہا ہے۔

انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک ہے زندگی کی ضرورت، اور دوسرا ہے زندگی کا مقصد۔ موجودہ زمانے کی ترقیوں کا ایک بُرا پہلو یہ ہے کہ اس نے ضرورت کے سامان بہت زیادہ بڑھا دیے اور ان سامانوں کو بہت زیادہ خوش نما بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب انسان کی ساری توجہ ضرورت کی چیزوں پر لگ گئی۔ ضرورت کی فہرست اتنی زیادہ لمبی ہوگئی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ ضرورت کے سامانوں کا حصول ہی انسان کے لیے سب کچھ بن گیا۔ پچھلے زمانے میں ضرورت کی تکمیل چند سادہ چیزوں سے ہو جاتی تھی، مگر اب اس کی فہرست اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ وہ کبھی ختم ہی نہیں ہوتی۔

سامانِ ضرورت نے اب ایک مستقل مذہب کی صورت اختیار کر لی ہے، جس کا نام کنزیومرازم ہے۔ اس کا سنگین انجام یہ ہوا ہے کہ اب کسی انسان کے پاس مقصدِ حیات کے سوال پر سوچنے کا وقت نہیں۔ اب اعلیٰ مقصد ایک نامانوس لفظ بن گیا ہے۔ اس صورت حال کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کی جاسکتا ہے کہ جدید کنزیومرازم نے انسان کو حیوانی سطح پر جینے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ انسانیت کی اعلیٰ سطح پر جینا، اب لوگوں کے لیے ایک غیر معروف لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس صورت حال کی بھاری قیمت انسان کو یہ دینی پڑی ہے کہ اس کا ذہنی ارتقاء (intellectual development) رُک گیا ہے۔ آج تقریباً تمام انسانوں کا یہ حال ہو رہا ہے کہ ان سے اُن کے پروفیشنل موضوع پر بات کیجیے تو وہ اس میں خوب ماہر دکھائی دیں گے۔ لیکن اگر ان کے پروفیشنل موضوع کے علاوہ دوسرے انسانی موضوعات پر بات کیجیے تو ایسا محسوس ہوگا گویا کہ آپ ایک نادان انسان سے بات کر رہے ہیں۔ جسمانی اعتبار سے بظاہر وہ پُر رونق دکھائی دیں گے لیکن ذہنی معیار کے اعتبار سے وہ ایک بَونا انسان معلوم ہوں گے۔

موجودہ کنزیومر کلچر کو اگر حیوانی کلچر کا نام دیا جائے تو شاید وہ غلط نہ ہوگا۔ حیوانی کلچر کے اِس فروغ کا یہ سنگین نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ موجودہ زمانے کے عورت اور مرد ایک قسم کے ذہنی بونے پن (intellectual dwarfism) کا شکار ہو کر رہ گیے ہیں۔

آج کے انسان کا حال یہ ہے کہ اس کو جسمانی غذا تو خوب مل رہی ہے، مگر دوسرے پہلو سے وہ ذہنی فاقہ (intellectual starvation) کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ آج انسان کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ اس کو ذہنی فاقے کے اِس بحران سے باہر نکالا جائے۔ اس کو شعوری اعتبار سے اِس قابل بنایا جائے کہ وہ زیادہ گہرے حقائق پر سوچ سکے۔ وہ زیادہ بامعنیٰ موضوعات کو اپنی توجہ کا مرکز بنا سکے۔ وہ حیوان کی سطح سے بلند ہو کر انسان کی سطح پر جینے لگے۔

انسان کی ذہنی تاریخ کے دو دَور ہیں۔ ایک، کنزیومر کلچر کے فروغ سے پہلے، اور دوسرا، کنزیومر کلچر کے فروغ کے بعد۔ گہرائی کے ساتھ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ کنزیومر کلچر کے فروغ سے پہلے انسان نے علم اور ادب کے میدان میں بہت زیادہ ترقیاں حاصل کی تھیں۔ اس زمانے میں بہترین علمی اور ادبی کتابیں وجود میں آئیں۔ مگر کنزیومر کلچر کے فروغ کے بعد یہ ہوا کہ علم وادب کی ترقی رُک گئی۔ بعد کے اِس دور میں مشکل ہی سے کسی ایسی کتاب کا نام لیا جاسکتا ہے جو علم وادب کے اعتبار سے اعلیٰ معیار پر تیار کی گئی ہو۔

اس فرق کا معاملہ خود سائنس تک پہنچا ہے۔ کنزیومر کلچر کے فروغ سے پہلے نظری سائنس کو زبردست ترقی ہوئی تھی۔ سائنس کے شعبوں میں بڑے بڑے اہلِ دماغ پیدا ہوئے، مگر کنزیومر کلچر کے فروغ کے بعد نظری سائنس کی ترقی تقریباً رُک گئی۔ اب اہلِ سائنس زیادہ تر اُن موضوعات پر کام کررہے ہیں جو آج کل کی اصطلاح میں مارکیٹ ایبل (marketable) آئٹم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پچھلے دَور میں سائنس، علمی تحقیق کا نام تھی۔ مگر اب سائنس زیادہ تر ایک قسم کی اقتصادی سرگرمی (comercial activity) بن کر رہ گئی ہے۔

اِس صورتِ حال کا یہ بھیانک نتیجہ ہوا ہے کہ علمی اور ذہنی ترقی کا سفر تقریباً رُک گیا ہے۔ ہر طرف خوش نما انسان چلتے پھرتے نظر آتے ہیں مگر حقیقی انسان تلاش کرنے کے باوجود کہیں نہیں ملتا۔ اِس صورتِ حال کو بدلنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ انسانی آبادی ایک نئے قسم کا جنگل بن کر رہ جائے گی، قدرتی جنگل اور تمدنی جنگل میں صرف یہ فرق ہوگا کہ قدرتی جنگ کے حیوان فطرت کے لباس میں چل

پھر رہے ہوں گے، اور تمدّن کے جنگل میں خوش پوش حیوان چلتے پھرتے دکھائی دیں گے۔

نظریۂ ارتقاء کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان اور حیوان کا جسم بہت زیادہ ایک دوسرے سے مشابہ ہے۔ جسمانی افعال دونوں کے اندر یکساں قسم کے پائے جاتے ہیں۔ غذائی ہضم کا نظام جو ایک کے اندر ہے وہی دوسرے کے اندر بھی ہے۔ گویا کہ حیوان چار پاؤں سے چلنے والا انسان ہے، اور انسان دو پیروں سے چلنے والا حیوان۔

مگر نفسیات کا مطالعہ ایک مختلف تصویر پیش کرتا ہے۔ نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان ساری کائنات میں ایک انتہائی استثنائی مخلوق کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کی اس استثنائی حیثیت کا سبب صرف ایک ہے اور وہ انسان کا دماغ ہے۔ انسان کا دماغ انسان کو نہ صرف حیوانات سے بلکہ کائنات کی تمام چیزوں سے ممتاز طور پر مختلف بنا دیتا ہے۔ انسان کا دماغ انسان کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے۔ یہ دماغ انسان کو ایک ایسی ممتاز حیثیت دے دیتا ہے جو وسیع کائنات میں کسی بھی دوسری چیز کو حاصل نہیں۔

کنزیومرازم کے کلچر نے انسان کے جسمانی حصے کو تو بہت کچھ دیا مگر اس کے ذہنی حصّے کو تقریباً معطّل کر دیا۔ حالاں کہ یہ ذہنی حصّہ ہی انسان کا اصل وجود ہے۔ یہ ذہنی حصہ ہی انسان کو انسان بناتا ہے۔ ذہنی حصے کے بغیر انسان صرف حیوان ہے۔

اس کمی کو دور کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ آج احیاءِ انسانیت کی تحریک چلائی جائے۔ انسان کو دوبارہ اس کی فطرت کی طرف لوٹایا جائے۔ انسان کو دوبارہ انسان بنایا جائے۔ انسان کو اِس قابل بنایا جائے کہ وہ دوبارہ اپنے ذہنی امکانات کو بروئے کار لائے۔ وہ ذہنی ارتقاء کے راستے پر دوبارہ سرگرمِ سفر ہو جائے۔

خدااور آخرت

تخلیق اپنے آپ میں خالق کا ثبوت ہے۔کائنات اتنا زیادہ بامعنٰی واقعہ ہے کہ یہ ناقابل تصور ہے کہ کسی کے بنائے بغیر وہ بن گئی ہو۔حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں ہمارے لیے چوائس باخدا کائنات اور بےخدا کائنات میں نہیں ہے بلکہ حقیقی انتخاب باخدا کائنات یا غیر موجود کائنات میں ہے۔ کیوں کہ اگر ہم خدا کے وجود کو نہ مانیں تو ہمیں خود کائنات کو غیر موجود ماننا پڑے گا۔اور ہمارے لیے ایسا چوائس سرے سے ممکن ہی نہیں۔

The choice for us in this regard is not between universe with God or universe without God. This is not the choice. The real choice is between universe with God or no universe at all. If we say that God does not exist then we are also compelled to say that the universe does not exist. But the universe is too obvious a fact that we are not in a position to deny the existence of the universe. So we can not deny the existence of God.

بامعنٰی کائنات

سر جیمس جینز نے کہا تھا کہ کائنات کا خالق ایک ریاضیاتی دماغ (mathematical mind) ہے۔میں کہوں گا کہ ہماری دنیا اتنی زیادہ بامعنٰی ہے کہ وہ اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا خالق معنویت کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ایسا خالق ایک ایسی دنیا کی تخلیق نہیں کر سکتا جو اپنے انجام کے اعتبار سے ناقص ہو۔یہ ناممکن ہے کہ ایک بامعنٰی خالق ایک بےمعنٰی کائنات کی تخلیق کرے۔کائنات اپنی ساری معنویت کے باوجود اپنی موجودہ حالت میں ناقص ہے۔وہ اپنی تکمیل کے لیے ایک اور دنیا کی طالب ہے۔یہی وہ دنیا ہے جس کو پیغمبروں نے آخرت کی دنیا کہا ہے۔

یہ آخرت کی دنیا صرف عقیدے کی بات نہیں۔وہ پوری طرح ایک علمی واقعہ ہے۔عالم آخرت

کے وجود کو ٹھیک اسی علمی معیار پر ثابت کیا جاسکتا ہے جس معیار پر سائنس میں دوسری تمام چیزوں کو ثابت کیا جاتا ہے۔

سائنسی ثبوت

اس معاملے میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ سائنٹفک پروف کیا ہے۔موجودہ سائنس کے مطابق، سائنٹفک پروف یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کے معاملے میں تیقن (certainty) کا درجہ حاصل ہو جائے۔ اس قسم کا نا قابلِ انکار تیقن کسی بھی چیز کے بارے میں ممکن نہیں۔ جدید سائنسی موقف کے مطابق، کسی چیز کا علمی طور پر ثابت ہوجانا یہ ہے کہ اس کا قرینہ یا امکان (probability) ثابت ہوجائے۔ جدید سائنس میں جن نظریات کو مسلّمہ کے طور پر مانا جاتا ہے ان کو صرف اس لیے مانا جاتا ہے کہ ان کا امکان ثابت ہوگیا، نہ یہ کہ مشاہداتی سطح پر ان کے واقع ہونے کا قطعی علم حاصل ہوگیا ہے۔ ایٹم کے اسٹرکچر کو بطور حقیقت ماننا اسی نوعیت کی ایک مثال ہے۔

عالم آخرت کے وجود کو ماننے کے لیے بھی ہمیں اسی مسلّمہ سائنٹفک متھڈ کو استعمال کرنا ہوگا۔ اس کے سوا کسی دوسرے متھڈ کو استعمال کرنا اصولی طور پر درست نہیں۔ کیوں کہ علمی طور پر ہم ایسا نہیں کرسکتے کہ دوسرے معاملات میں جس سائنٹفک متھڈ کو ہم معقول (valid) مانیں، عالم آخرت کے بارے میں ہم اس متھڈ کے استعمال سے انکار کردیں۔

تین علمی اصول

جیسا کہ معلوم ہے، اس طرح کے معاملے میں تین علمی اصول (scientific method) کے تین اجزاء ہیں۔ وہ اجزاء یہ ہیں — مفروضہ، مشاہدہ، اور تصدیق:

Hypothesis, Observation, Verification

اس سہ نکاتی فارمولے کو عالم آخرت کے وجود کے معاملے میں استعمال کیا جائے تو ہم یقینی طور پر ایک موافق قرینہ یا ایک تائیدی امکان تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور جیسا کہ عرض کیا گیا، قرینہ یا امکان تک پہنچنے ہی کا دوسرا نام تیقن (certainty) ہے۔

اس موضوع کا مطالعہ کرتے ہوئے پہلا قرینہ یہ سامنے آتا ہے کہ انسان دوسری تمام مخلوقات سے مختلف ہے۔ یہ انسان کی ایک استثنائی صفت ہے کہ وہ کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ انسان کے سوا جمادات اور نباتات اور حیوانات میں سے کوئی بھی نہیں جو اپنے اندر کل کا تصور رکھتا ہو۔ اس مشاہدے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے سوا دوسری تمام مخلوقات کی منزل صرف آج ہے۔اس کے مقابلہ میں انسان کی منزل آئندہ آنے والے کل (tomorrow) سے تعلق رکھتی ہے۔

انسانی جسم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کا جسم ان گنت خلیوں (living cells) سے بنا ہے۔ یہ خلیے ہر لحہ ٹوٹتے رہتے ہیں۔اس طرح انسان کا جسم بار بار پرانا ہونے کے بعد نیا ہوتا رہتا ہے جیسا کہ بہتے ہوئے دریا کا پانی ہر وقت پرانا اور نیا ہوتا رہتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی شخصیت اس کے جسم سے الگ ایک مستقل وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔جسم پر موت واقع ہوتی ہے مگر اس کی روحانی شخصیت بدستور باقی رہتی ہے۔

اسی طرح ہر انسان کے اندر نہایت گہری خواہشیں موجود ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان خواہشات کو طلب کرنے والا ایک حیوان ہے:

Man is a desire-seeking animal.

مگر اسی کے ساتھ تجربہ بتاتا ہے کہ کسی بھی انسان کی یہ خواہشیں پوری نہیں ہوتیں۔ ہر انسان اپنی خواہشات کے مطابق، اپنے لیے ایک معیاری دنیا بنانا چاہتا ہے مگر ہر انسان جلد ہی مر جاتا ہے، اس سے پہلے کہ اس نے اپنی خواہشوں کے مطابق اپنا مطلوب کل بنایا ہو۔

امید کی کرن

امریکی مشنری بلی گرہم نے لکھا ہے کہ اس کو ایک بار ایک امریکی دولت مند کا ارجنٹ پیغام ملا۔ اس پیغام میں کہا گیا تھا کہ مجھ سے فوراً ملو۔ بلی گرہم نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔ وہ فوراً سفر کر کے مذکورہ امریکی دولت مند کے پاس پہنچا۔ بلی گرہم کا بیان ہے کہ جب میں امریکی دولت مند کے گھر پہنچا تو وہ فوراً مجھ کو اپنے وسیع مکان کے ایک الگ کمرے میں لے گیا۔ یہاں ہم دونوں دو کرسیوں پر آمنے

سامنے بیٹھے۔ اس کے بعد امریکی دولت مند نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ بلی گرہم سے کہا کہ دیکھو، میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ زندگی اپنی ساری معنویت کھو چکی ہے۔ میں نامعلوم کی طرف ایک فیصلہ کن چھلانگ لگانے والا ہوں۔ اے نوجوان! کیا تم مجھے امید کی ایک کرن دے سکتے ہو:

> You see, I am an old man. Life has lost all meaning. I am going to take a fateful leap into the unknown. Young man can you give me a ray of hope.

یہ سوال صرف ایک امریکی دولت مند کا سوال نہیں۔ اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر آدمی اس سوال سے دوچار ہوتا ہے، عورت بھی اور مرد بھی۔ اس سوال کا معقول جواب صرف عالم آخرت کے عقیدے میں ملتا ہے۔ اگر موت کے بعد ایک اور دنیا کو نہ مانا جائے تو یہ عالمگیر سوال ہمیشہ کے لیے بے جواب ہو کر رہ جائے گا۔

تضاد کا خاتمہ

انسان کے بارے میں اس قسم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد پیدائشی طور پر دو متضاد صفات رکھتے ہیں۔ ایک طرف ہر ایک کی بے پناہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی ایک مطلوب دنیا (dream world) بنائے، ایک ایسی دنیا جو اس کے آئیڈیل کے مطابق ہو اور جہاں وہ اپنے ''کل'' کے دورِ حیات کو خوشیوں اور راحتوں کے ساتھ گزار سکے۔ مگر دوسری طرف ہر انسان اس تضاد میں مبتلا ہے کہ وہ بظاہر تمام مادی چیزیں حاصل کر لینے کے باوجود اپنی مطلوب دنیا بنا نہیں پاتا۔ بورڈم، نقصان، بیماری، ایکسیڈنٹ، بوڑھاپا اور آخر میں سو سال سے بھی کم مدت میں موت، یہی اس دنیا میں ہر انسان کی کہانی ہے۔

یہی معاملہ ہر عورت اور ہر مرد کا ہے۔ ہر ایک اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں ایک آئیڈیل کا تصور بسا ہوا ہوتا ہے۔ مگر ہر ایک اپنی حسین تمناؤں کو لیے ہوئے مر جاتا ہے، قبل اس کے کہ اس نے اپنی مطلوب دنیا کو عملاً پایا ہو۔

یہاں دوبارہ ایک مشاہدہ سامنے آتا ہے۔ یہ مشاہدہ کہ دنیا میں عالمگیر طور پر زوجین (pairs)

کا اصول قائم ہے۔ یہاں ہر چیز جوڑے جوڑے کی صورت میں ہے۔ ہر چیز دو کے ملنے سے مکمل ہوتی ہے— ایٹم میں نگیٹیو پارٹکل اور پازیٹیو پارٹکل، ستاروں کی دنیا میں جوڑا ستارے (pair stars)، نباتات کی دنیا میں نر اور مادہ، حیوانات کی دنیا میں مذکر اور مؤنث، انسان کی دنیا میں مرد اور عورت۔

اس عالمگیر فطری اصول کو زوجین کا اصول (pair principle) کہا جاسکتا ہے۔ یہ اصول بتاتا ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر اپنے آپ کو مکمل کرتی ہے۔ اسی عالمگیر اصول میں مذکورہ سوال کا جواب ہے۔ اس کے مطابق، ہماری دنیا میں ایک جوڑا دنیا (pair world) ہے۔ موجودہ دنیا کے ساتھ ایک اور دنیا موجود ہے اور اس دنیا کے ملنے ہی سے موجودہ دنیا اپنے وجود کو مکمل کرتی ہے۔

آغاز کی تکمیل

اب مذکورہ مشاہدہ کی روشنی میں دیکھئے تو اس بات کی واضح تصدیق ہوجاتی ہے کہ عالم آخرت کا نظریہ درست ہے۔ عالم آخرت وہ جوڑا دنیا ہے جس کے ملنے سے موجودہ دنیا اپنے وجود کی تکمیل کرتی ہے۔ اس جوڑا دنیا سے ملے بغیر ہماری موجودہ دنیا اسی طرح نامکمل ہوجاتی ہے جس طرح اس کائنات کی دوسری تمام چیزیں اپنے جوڑے کے بغیر نامکمل رہتی ہیں۔

ہماری دنیا کا دو دنیاؤں کی صورت میں ہونا بہت بامعنٰی ہے۔ اس دوسری دنیا کو ماننے کے بعد انسانی وجود ایک مکمل وجود بن جاتا ہے۔ اب ہر چیز اپنی معنویت پالیتی ہے۔ اب ہر چیز اپنے خانے میں فٹ بیٹھ جاتی ہے:

Everything falls into place.

درست فریم ورک

یہ تصور ہم کو وہ فریم ورک دے دیتا ہے جس میں زندگی اور کائنات کی ہر چیز اپنی اطمینان بخش توجیہہ پاسکے۔ اس تصور سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ جنت اور جہنم کیا ہے۔ جنت گویا سنجیدہ اور حق پرست لوگوں کی آرام گاہ ہے، اور جہنم گویا سرکش اور باطل پرستوں کا عذاب خانہ۔

اس کے مطابق جو تصویر بنتی ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا کو عالم امتحان (testing ground)

کے طور پر بنایا گیا اور اگلی دنیا کو اپنا انجام پانے کی جگہ کے طور پر تخلیق کیا گیا۔ انسان کو پیدائشی طور پر ابدی مخلوق کی حیثیت سے بنایا گیا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو ہمیشہ زندہ رہنے والی شخصیت عطا ہوئی ہے۔ تاہم انسان کی زندگی گویا آئس برگ کی مانند ہے جس کا بہت چھوٹا حصہ اوپر دکھائی دیتا ہے اور اس کا پورا بقیہ وجود سمندر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کی مدت عمر (life span) دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کا بہت چھوٹا حصہ موجودہ دنیا میں رکھا گیا ہے اور اس کی مدت حیات کا زیادہ بڑا حصہ عالم آخرت میں رکھ دیا گیا ہے۔

موجودہ دنیا کی ہر چیز انسان کے لیے امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز اس لیے ہے تا کہ انسان اپنی شخصیت کو مکمل کرے۔ مثال کے طور پر موجودہ دنیا طرح طرح کی تلخیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ انسان ان تجربات سے گزرتے ہوئے یہ ثبوت دے کہ وہ منفی حالات میں بھی مثبت احساسات کے ساتھ جی سکتا ہے۔ ایسی ہی مثبت شخصیات کے لوگ جنت کی معیاری دنیا میں داخل کیے جائیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ ردعمل کا شکار ہو گئے اور منفی تجربات کے درمیان خود بھی منفی بن گئے، ایسی منفی شخصیت رکھنے والے لوگوں کو جنت کے لیے نااہل قرار دیا جائے گا۔ وہ جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے جہاں سے وہ کبھی نکل نہ سکیں گے۔

عضویاتی ارتقاء کے نظریے کو موجودہ زمانے میں سائنٹفک فیکٹ سمجھا جاتا ہے۔ ایسا اس لیے نہیں ہے کہ عضویاتی ارتقاء کے نظریے کے حق میں مشاہداتی دلائل حاصل ہو گئے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ نظریہ ارتقاء کو ماننے کی صورت میں حیاتیاتی شواہد کی ایک قابل فہم توجیہہ حاصل ہو جاتی ہے۔ جب کہ علماء سائنس کے نزدیک، دوسرا کوئی ایسا نظریہ موجود نہیں جو معلوم حیاتیاتی شواہد کی توجیہہ کرتا ہو۔ گویا نظریہ ارتقاء ایک قابل عمل نظریہ (workable theory) ہے نہ کہ معروف معنوں میں کوئی ثابت شدہ نظریہ (proved theory)۔

اطمینان بخش توجیہہ

اس سائنسی اصول کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں تمام معلوم

شواہد کی تشفی بخش توجیہہ مل جاتی ہے، جب کہ عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں سب کچھ نا قابل توجیہہ بنا رہتا ہے۔

عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں موجودہ دنیا ادھوری معلوم ہوتی ہے، جب کہ عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں موجودہ دنیا مکمل نظر آنے لگتی ہے۔ عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں یہ بات نا قابل فہم بنی رہتی ہے کہ بہت سے سچے اور اچھے انسان دنیا سے اس طرح چلے گئے کہ انھیں اپنی سچائی کا کوئی انعام نہیں ملا۔ مگر عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں یہ اشکال پوری طرح ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں موجودہ دنیا کا یہ واقعہ نا قابل توجیہہ بنا رہتا ہے کہ یہاں کیوں ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ برائی اور سرکشی کرتے ہیں مگر یہاں وہ اپنی برائی کی سزا نہیں پاتے۔ مگر عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں ہم کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب مل جاتا ہے۔

اسی طرح عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں یہ بات مکمل طور پر نا قابل فہم رہتی ہے کہ کیوں ایسا ہوتا ہے کہ انسان یہاں ایک آئیڈیل ورلڈ کا تصور لے کر پیدا ہوتا ہے، مگر ہر شخص اس آئیڈیل ورلڈ کو پائے بغیر اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں یہ اشکال مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ اب انسان اس یقین کے ساتھ موجودہ دنیا میں رہ سکتا ہے کہ جس مطلوب چیز کو وہ قبل از موت دنیا میں نہ پا سکا وہ اس کو بعد از موت دنیا میں پالے گا۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی چیز عبث پیدا نہیں کی گئی۔ سورج چاند کا نظام ہو یا زمین کے کیڑے مکوڑے سب ایک مقصد کے تحت پیدا کئے گئے ہیں اور وہ اپنے اس مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ اس حالت میں اس دنیا میں صرف ایک ہی چیز ایسی ہے جو بظاہر بلا مقصد معلوم ہوتی ہے۔ ہر عورت اور مرد کے اندر پیدائشی طور پر حسین تمناؤں کا ایک تصور بسا ہوا ہے، کوئی بھی عورت یا مرد اس سے خالی نہیں۔ پھر جب اس دنیا کی دوسری تمام چیزیں واضح مقصد کے تحت پیدا کی گئی ہیں تو یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کی خواہشیں اور تمنائیں بھی اپنی ایک حقیقی منزل رکھتی ہوں۔ جس کائنات میں ہر چیز بامقصد ہو وہاں انسان کی خواہشیں اور تمنائیں بے مقصد نہیں ہو سکتیں۔

یقینی طور پر یہ خواہشیں اور تمنائیں بھی سوچی سمجھی تخلیق ہیں۔ ان کی پیدائش کا ایک واضح مقصد ہے۔ البتہ یہ مقصد موجودہ محدود دنیا میں پورا نہیں ہوسکتا۔ یہ خواہشیں اور تمنائیں لامحدود ہیں اور وہ ایک لامحدود دنیا ہی میں پوری ہوسکتی ہیں۔ اسی لامحدود دنیا کا نام آخرت ہے۔

آخرت کی اس لامحدود دنیا میں اچھے لوگوں کو ابدی جنت ملے گی جو ہر قسم کی خوشیوں اور راحتوں سے بھری ہوئی ہوگی۔ اس کے برعکس جو لوگ موجودہ دنیا میں برے ثابت ہوں ان کو آخرت کی دنیا میں جہنم میں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ مجبور ہوں گے کہ وہ اپنی برائیوں کی سزا ابدی طور پر بھگتتے رہیں۔

جنت کی حقیقت

جنت کیا ہے۔ جنت انسان کی تلاش کا جواب ہے۔ انسان اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں وہ ایک انوکھے استثناء کی حیثیت رکھتا ہے۔ وسیع کائنات کا ہر جزء اپنے آپ میں مکمل ہے۔ یہاں صرف انسان ہے جو اپنے آپ میں مکمل نہیں۔ پوری کائنات ایک بےنقص (zero-defect) کائنات ہے۔ یہاں صرف انسان ہے جو استثنائی طور پر ناقص وجود کی حیثیت رکھتا ہے۔

کائنات میں ہر طرف یقین (certainty) ہے اور انسان کی دنیا میں غیر یقینیت (uncertainty)۔ بقیہ کائنات میں کہیں خوف (fear) دکھائی نہیں دیتا مگر انسان ہمیشہ خوف اور اندیشے سے دوچار رہتا ہے۔ بقیہ کائنات میں ہر طرف تسکین (satisfaction) کی حالت ہے اور انسان کی زندگی میں بےتسکین (dissatisfaction) کی حالت ہے۔ بقیہ کائنات میں ہر چیز کا حال یہ ہے کہ جو کچھ اس کو چاہئے وہ سب اس کو مل رہا ہے مگر انسان اس دنیا کی واحد مخلوق ہے جو اسی احساس میں مبتلا رہتا ہے کہ جو کچھ اس نے چاہا وہ اس کو نہیں ملا۔ بقیہ کائنات ایک برائی سے پاک (evil-free) کائنات ہے۔ مگر انسان استثنائی طور پر اس مسئلے سے دوچار ہے جس کو برائی کا مسئلہ (problem of evil) کہا جاتا ہے۔

جنت اسی سوال کا جواب ہے۔ جنت کا تصور بتاتا ہے کہ انسان کے لیے بھی وہ سب کچھ پوری

طرح موجود ہے جو بقیہ کائنات کو ملا ہوا ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ بقیہ کائنات کو اپنا مطلوب آج میں مل رہا ہے، جب کہ انسان کو اس کا مطلوب کل میں ملے گا۔ دونوں کے معاملات کا یہی فرق ہے جس کی بنا پر ایسا ہے کہ بقیہ کائنات کے پاس کل (tomorrow) کا تصور نہیں۔ یہ صرف انسان ہے جو استثنائی طور پر کل کے تصور میں جیتا ہے۔

فطرت کا حصہ

خدا اور آخرت کا معاملہ بظاہر غیر مشہود دنیا (unseen world) سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت انسانی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ انسان کی فطرت خدا اور آخرت کے معاملے کو ایک معلوم صداقت کے طور پر جان لیتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ خدا کی معرفت کے دو درجے ہیں۔ ایک عقلی اور دوسرا فطری۔ خدا اور آخرت کے وجود کو عقلی سطح پر ماننا اس معرفت کا صرف ابتدائی درجہ ہے جب کہ خدا اور آخرت کے وجود پر فطری سطح پر یقین کرنا اس کا انتہائی درجہ۔ خدا اور آخرت کے معاملے میں عقلی دلائل کے استعمال کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اوپر سے شک کے پردے کو ہٹا دیا جائے۔ انسان کو اس مقام تک لایا جائے جہاں وہ خدا اور آخرت کے معاملے کو کم از کم امکانی صداقت کے طور پر قبول کر لے۔

خدا اور آخرت کے معاملے میں دلیل اور منطق کے استعمال کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کو اس فکری سطح پر لایا جائے جہاں وہ خدا اور آخرت کے وجود کو بطور ایک نظریہ ماننے کے لیے تیار ہو جائے۔ جب آدمی اس حالت تک پہنچ جائے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس نظریے کو ماننے کے لیے اس کی فطرت کے دروازے کھل جائیں۔ وہ اس کو ایک فطری سچائی کے طور پر پہچان کر اپنا لے۔

ہر انسان کے پاس وہ آنکھ موجود ہے جو خدا اور آخرت کو دیکھ سکے مگر اس آنکھ کے اوپر کنڈیشننگ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ منطقی دلیل یہ کام کرتی ہے کہ وہ اس کنڈیشننگ یا اس ذہنی رکاوٹ (mental block) کو توڑ کر اس مصنوعی پردے کو فطرت کی آنکھ سے ہٹا دے۔ اس کے بعد انسان خدا اور آخرت کو صاف دیکھنے لگتا ہے۔ اب انسان بظاہر نہ دکھائی دینے والے خدا کے وجود پر

اسی طرح کامل یقین کر لیتا ہے جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کے وجود پر کامل یقین رکھتا ہے۔ حالاں کہ اس نے کبھی اپنے آپ کو ماں کے پیٹ سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔

خدا اور آخرت کا معاملہ صرف اس وقت تک منطقی بحث کا موضوع رہتا ہے جب تک کہ آدمی کے ذہن کا مصنوعی پردہ ہٹا نہ ہو۔ غور وفکر یا منطقی استدلال کے ذریعے جب یہ پردہ ہٹ جائے تو انسان اپنے خدا کو خود اپنی داخلی معرفت کے تحت پہچان لیتا ہے۔ اب خدا اس کے لیے تمام معلوم چیزوں سے زیادہ معلوم واقعہ بن جاتا ہے۔ منطقی دلیل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ انسان کو فطرت کے دروازے تک پہنچا دے۔ فطرت کا دروازہ کھلتے ہی انسان خدا کو اس طرح پالیتا ہے جیسے کہ وہ پہلے ہی سے اس کو جانتا تھا۔

انسان کی آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی ہو تو ضرورت ہوتی ہے کہ سورج کے وجود کو اس کے لیے دلائل سے ثابت کیا جائے۔ لیکن جب آنکھ کی پٹی ہٹا دی جائے تو اس کے بعد سورج کو ماننے کے لیے اسے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی معاملہ خدا کا ہے۔ خدا کا شعور انسان کی فطرت میں آخری حد تک سمایا ہوا ہے۔ اصل ضرورت صرف فطرت کا پردہ ہٹانے کی ہے۔ دلیل کے ذریعے جب فطرت کا پردہ ہٹا دیا جائے تو انسان خدا کو اس سے بھی زیادہ یقین کے ساتھ دیکھنے لگتا ہے جتنا کہ ایک کھلی آنکھ والا انسان آفتاب کو۔

حادثہ، توجیہہ کے لیے کافی نہیں

Predictable Universe

اپنی کتاب مذہب اور جدید چیلنج (God Arises) مَیں نے ۱۹۶۴ میں لکھی تھی۔ اس کتاب میں دکھایا گیا تھا کہ یہ کائنات بے حد بامعنٰی کائنات ہے۔ ایسی بامعنٰی کائنات کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بن سکتی۔ اس میں جو باتیں درج تھیں، اُن میں سے ایک بات یہ تھی کہ:

''۱۱/اگست ۱۹۹۹ء میں ایک سورج گرہن واقع ہوگا جو کارنوال (Cornwall) میں مکمل طور پر دیکھا جاسکے گا:

On August 11, 1999, there will be a Solar eclipse that will be completely visible at Cornwall". (p. 99)

میں نے یہ بات ۱۱/اگست ۱۹۹۹ سے ۳۵ سال پہلے لکھی تھی۔ اس تحریر کے ۳۵ سال بعد جب ۱۱/اگست ۱۹۹۹ء کی تاریخ آئی تو اس پیشگی بیان کے عَین مطابق، ٹھیک مقرّرہ وقت پر سورج گرہن ہوا۔ اِس کے واقع ہونے میں ایک منٹ کا بھی فرق نہیں ہُوا۔

میں نے یہ بات بطور خود نہیں لکھی تھی، بلکہ وہ علمائے فلکیات کے حسابات (calculations) کی بنیاد پرلکھی تھی۔ علمائے فلکیات پیشگی طور پر اتنا صحیح اندازہ کرنے میں اس لیے کامیاب ہوئے کہ کائنات انتہائی محکم قوانین پر چل رہی ہے کہ کروروں سال گذرنے پر بھی اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔ اسی دریافت کی بنا پر ایک سائنس داں (سرجیمس جینز) نے اپنی کتاب ''مسٹیر یس یُونیوَرس'' میں لکھا ہے کہ: کائنات کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بنانے والا ایک ریاضیاتی دماغ (Mathmetical Mind) ہے۔

کسی چیز کے بامعنٰی ہونے کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ وہ قابل پیشین گوئی یا قابِلُ التَّنَبُّؤ (predictable) ہو۔ یہ صفت موجودہ کائنات میں مکمل طور پر موجود ہے۔ جس کا ایک ثبوت اوپر کی مثال میں نظر آتا ہے۔

جو لوگ خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ موجودہ کائنات ایک اتفاقی حادثہ (accident) کے طور پر وجود میں آئی ہے نہ کہ کسی خالق کے ارادے کے تحت۔ یہ جملہ گریمر کے اعتبار سے درست ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ درست نہیں۔ اگر یہ مانا جائے کہ موجودہ بامعنٰی کائنات ایک حادثے کے طور پر ظہور میں آئی ہے تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بےشعور حادثہ بھی ایک ایسا عامل ہے جو بامعنٰی چیز کو وجود میں لاسکتا ہے۔ ایسی حالت میں اس حادثے کو لازمی طَور پر قابلِ تکرار (repeatable) ہونا چاہیے۔ اُس کو بار بار وقوع میں آنا چاہیے۔ جس طرح بےشعور حادثے نے ایک بار ایک بامعنٰی کائنات بنائی، اسی طرح دوبارہ ایسا ہونا چاہیے کہ حادثات کے ذریعے کوئی بامعنی چیز وجود میں آجائے۔

مگر جیسا کہ معلوم ہے، دوبارہ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ سائنسی اندازے کے مطابق، کائنات کی عمر تقریباً پندرہ بلین سال ہے۔ کیا وجہ ہے کہ اس لمبے عرصے میں کوئی بامعنٰی کائنات استثنائی طور پر صرف ایک بار وجود میں آئی، اس کے بعد کبھی نہیں، حتیٰ کہ جُزئی طور پر بھی نہیں۔ مثلاً ایسا نہیں ہُوا کہ دوبارہ کوئی نیا شمسی نظام بن جائے، دوبارہ کسی سیّارے پَر پانی اور ہَوا اَور سبزہ جیسی چیزیں وجود میں آجائیں، دوبارہ کوئی ایسی زمین بن جائے جہاں انسان اور حیوان پیدا ہو کر چلنے پھرنے لگیں۔ یہ استثناء واضح طور پر ارادی تخلیق کا ثبوت ہے۔

تمام انسانی عُلوم کے مطابق، موجودہ دنیا کامل طور پر ایک استثنائی واقعہ ہے۔ وہ تاریخِ موجودات میں ایک نادر استثناء ہے۔ کائنات کا استثناء ہونا منکرین خدا کے مذکورہ نظریے کی یقینی تردید ہے۔ کائنات اگر صرف ایک حادثے کا ظہور ہوتی تو یقینی طور پر وہ قابلِ تکرار ہوتی۔ اور جب وہ قابلِ تکرار نہیں تو حادثے کی اصطلاح میں اس کی توجیہہ کرنا بھی سراسر بے بنیاد ہے۔ ایسی توجیہہ علمی طور پر قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کا وجود اتنا ہی یقینی ہے جتنا کہ کسی انسان کے لیے خود اُس کا اپنا وجود۔ کوئی شخص اگر اپنے وجود کو مانتا ہے تو ٹھیک اسی دلیل سے اُس کو خدا کے وجود کو بھی ماننا پڑے گا۔ اپنے وجود کو

ماننااور خدا کے وجود کو نہ ماننا ایک فکری تضاد ہے۔ کوئی بھی سنجیدہ آدمی اس فکری تضاد کا تحمّل نہیں کرسکتا۔

سترہویں صدی کے مشہور فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ (René Descartes 1596-1650) نے کہا تھا کہ: ''میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں:

"I think, therefore I exist."

یہ اصول بلاشبہہ ایک محکم اصول ہے۔ اس اصول کے مطابق، خود شناسی آدمی کو خدا شناسی تک پہنچاتی ہے۔ اس اصول کے مطابق، یہ کہنا درست ہوگا کہ — میرا وجود ہے، اس لیے خدا کا وجود بھی ہے:

I exist, therefore God exists.

کائنات کا قابلِ تکرار نہ ہونا واضح طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کائنات کو ایک باشعور وجود نے اپنے ارادے کے تحت بنایا ہے۔ اس طرح پوری کائنات میں زمین ایک نادر استثناء ہے۔ لائف سپورٹ سسٹم جو زمین پر موجود ہے وہ وسیع کائنات میں کہیں بھی موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب پہلا انسان چاند پر گیا اور وہاں یہ دیکھا کہ چاند ایک خشک چٹان کے سوا اور کچھ نہیں تو اس کا یہ حال ہُوا کہ جب وہ دوبارہ زمین پر اُترا تو وہ جذباتی ہجوم کے تحت، زمین کے اوپر سجدے میں گر پڑا۔ کیوں کہ اُس نے زمین جیسی کوئی موافقِ حیات (pro-life) چیز خَلا میں کہیں اور نہیں دیکھی۔ خدا ایک ثابت شدہ وجود ہے، خدا کو ماننا ایک ثابت شدہ چیز کو ماننا ہے اور خدا کا انکار کرنا ایک ثابت شدہ چیز کا انکار کرنا۔

اسپریچولٹی اور اسپریچول ڈیولپمینٹ

ماں کو عام طور پر محبت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ماں لاڈ پیار(pampering) کی علامت ہے نہ کہ محبت کی علامت۔ لاڈ پیار صرف ایک جذباتی تعلق کا نام ہے۔ جب کہ محبت ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ مگر لاڈ پیار اور محبت میں فرق نہ کرنے کی بنا پر ماں کو ہزاروں سال سے محبت کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں کو صرف اپنے بیٹے سے محبت ہوتی ہے۔ عام انسانوں کے لیے ماں کے سینے میں محبت کے جذبات نہیں پائے جاتے۔

یہی معاملہ روحانیت(spirituality) کا ہے۔ روحانیت میں انسان کی مشغولیت معلوم طور پر پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ ہے۔ مگر ابھی تک روحانیت کا علم ترقی نہ کرسکا۔ اِس کا سبب روحانیت کا غیر واضح تصور ہے۔ روحانیت کو عام طور پر مبنی بَر قلب(heart-based) علم سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ روحانیت دوسرے علوم کی طرح، مبنی بَر ذہن(mind-based) علم ہے۔ ایسی حالت میں روحانیت کا علم ترقی نہیں کرسکتا تھا، کیوں کہ اُس کو معلوم ہی نہ تھا کہ روحانیت کا پوائنٹ آف ریفرنس حقیقتاً کیا ہے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے روشنی کا مطالعہ کرنے والے لوگ مون لائیٹ کو روشنی کا سرچشمہ سمجھ کر روشنی کا مطالعہ کریں۔ ایسے لوگ ہزاروں سال کی محنت کے باوجود روشنی کی حقیقت سمجھنے سے محروم رہیں گے۔ کیوں کہ انھوں نے غلط طور پر روشنی کا منبع چاند کو سمجھ لیا، حالاں کہ روشنی کا منبع سورج تھا۔

روحانی ترقی (spiritual development) دراصل فکری ترقی (intellectual development) کا دوسرا نام ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہماری اِس دنیا میں بنیادی طور پر دو چیزیں ہیں— شعور اور مادّہ۔ شعور کی ترقی کا نام فکری ترقی یا روحانی ترقی ہے، اور مادّی ترقی کا نام مٹیریل ترقی یا ورڈلی ڈیولپ مینٹ ہے۔

اِس دنیا کے پیدا کرنے والے نے یہاں بنیادی طور پر دو چیزیں پیدا کی ہیں۔ ایک، بے روح دنیا، جس کو مادّی دنیا کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے، ذی روح یا باشعور دنیا، جس کو انسان کہا جاتا

ہے۔ پیدا کرنے والے نے دونوں ہی دنیاؤں کو خام (crude) حالت میں پیدا کیا ہے۔ اب انسان کا یہ کام ہے کہ وہ اِس خام دنیا کو ترقی دے۔ وہ خام مادّے کے اندر چھپے ہوئے ترقیاتی امکانات کو واقعہ بنائے۔

مادّی دنیا کے اندر یہ عمل بڑے پیمانے پر ہوا۔ یہاں تک کہ غیر ترقی یافتہ دنیا نے ترقی کر کے وہ صورت اختیار کر لی جس کو ڈیولپڈ ورلڈ کہا جاتا ہے۔ اِس کا نتیجہ آج منصوبہ بند شہروں کی صورت میں نظر آتا ہے۔ جہاں ہر قسم کی اعلیٰ سہولتیں شان دار حالت میں دکھائی دیتی ہیں۔ مگر جہاں تک شعوری دنیا (انسان) کا معاملہ ہے وہ ترقیاتی منازل طے کرنے سے محروم ہے۔

شعوری وجود (انسان) کی ترقی کیا ہے۔ اس معاملے میں بھی یہی صورتِ حال ہے کہ شعوری وجود (انسان) کو پیدا کرنے والے نے اس کو خام حالت میں پیدا کیا ہے۔ اب یہ کرنا ہے کہ اِس خام شعوری وجود کو اعلیٰ ترقی یافتہ شعوری وجود میں کنورٹ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مادّی دنیا اور شعوری دنیا دونوں میں ایک ہی عمل مطلوب ہے، اور وہ کنورژن کا عمل ہے۔ یعنی مادّی دنیا کو کنورٹ کر کے اس کو ڈیولپڈ ورلڈ بنانا۔ اسی طرح شعوری وجود یا انسان خام حالت میں پیدا ہوتا ہے، اس کے بعد اس کو کنورٹ کر کے اس کو ایک ترقی یافتہ شخصیت بنانا ہے۔

انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پیدائشی طور پر وہ ایک خام شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ خام شخصیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر خارجی چیز سے اثر قبول کرتا رہتا ہے۔ مثلاً کسی نے اشتعال انگیز بات کی تو اس کے اندر غصہ آ گیا۔ کسی نے اس کی تحقیر کی تو وہ اس سے نفرت کرنے لگا۔ کسی کو اپنے سے بڑا دیکھا تو اس کے اندر حسد اور لالچ کا جذبہ آ گیا۔ کوئی اپنے سے کم نظر آیا تو اس کو اپنے سے چھوٹا سمجھ لیا۔ کہیں مفاد خطرے میں نظر آیا تو جھوٹ بول دیا کسی کے ساتھ مقابلہ پیش آیا تو اس کے خلاف تشدد کا طریقہ اختیار کر لیا، وغیرہ۔

اس قسم کے تمام جذبات کو ایک لفظ میں منفی فکر (negative thought) کہا جا سکتا ہے۔ ہر آدمی ایک سماج میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ساری زندگی سماج کے اندر گذرتی ہے۔ یہ سماجی تجربہ ہر آدمی

کے اندر منفی شخصیت کی تعمیر کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آدمی کی پوری شخصیت ایک منفی شخصیت بن جاتی ہے۔اس عمل کو کنڈیشننگ کا عمل کہا جاسکتا ہے۔کنڈیشننگ کا یہ عمل ہر شخص کے ساتھ ہوتا ہے،اس میں کسی بھی شخص کا کوئی استثناء نہیں۔ چنانچہ ہر آدمی کا کیس کنڈیشننگ کا کیس ہے۔اسی کنڈیشننگ کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر آدمی کم وبیش فخر، کبر،نفرت، حسد اور انتقام جیسی نفسیات میں جیتا ہے۔ ہر آدمی منفی کنڈیشننگ کا کیس بنا ہوا ہے۔اس معاملے میں لوگوں کے درمیان ڈگری کا فرق ہوسکتا ہے مگر ان کے درمیان نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔

انسان کی شخصیت کی تعمیر کا اصل مقصود یہی ہے کہ ہر عورت اور مرد اپنے ذہن کی ڈی کنڈیشننگ کرے۔ وہ اپنی ایک ایک کمزوری کو ڈھونڈ کر اپنے اندر سے نکالے اور پھر اس پر عملِ تطہیر جاری کر کے اپنی منفی شخصیت کو مثبت شخصیت میں کنورٹ کرے۔مثلاً غصے کو معافی میں کنورٹ کرنا،نفرت کو محبت میں کنورٹ کرنا، لالچ کو بے غرضی میں کنورٹ کرنا، گھمنڈ کو تواضع میں کنورٹ کرنا، بے اعترافی کو اعتراف میں کنورٹ کرنا،تشدد کو نرمی میں کنورٹ کرنا،انانیت کو انکساری میں تبدیل کرنا،وغیرہ۔

روحانیت یا اسپریچویلٹی دراصل اِسی شعوری عملِ تطہیر کا نام ہے۔روحانیت گویا ڈی کنڈیشننگ کا ایک عمل ہے۔ روحانیت کا مقصد یہ ہے کہ اپنے اوپر خود تعمیری کا عمل جاری کر کے اپنی ڈی کنڈیشننگ کرنا،اپنے آپ کو ایک ایسا انسان بنانا جو کامل طور پر ہر قسم کی کنڈیشننگ سے پاک ہو، جو دوبارہ اسی حالتِ فطری پر قائم ہو جائے جس پر وہ اوّل دن اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔

روحانیت کا یہی مقصد ہمیشہ سے لوگوں کے سامنے رہا ہے۔جن لوگوں نے روحانیت کو اپنا مقصد بنایا، وہ ہمیشہ سے یہی کہتے رہے ہیں کہ ہمارا مقصد اپنی اصلاح ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ اپنی داخلی شخصیت کو اعلیٰ شخصیت بنائیں۔اپنے آپ کو برے احساسات سے اٹھا کر اچھے احساسات میں جینے والا بنائیں۔

مگر تاریخ بتاتی ہے کہ انسان کبھی بھی یہ روحانی مقصود حاصل نہ کر سکا۔متصوفانہ قسم کے

روحانی عمل سے وہ اعلیٰ انسان پیدا نہیں ہو سکے جس کو اس عمل کا مقصود بتایا گیا تھا۔ جس چیز کو عام طور پر روحانی کامیابی سمجھا جاتا ہے وہ دراصل وجد (ecstasy) ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں روحانی کامیابی۔

اس ناکامیابی کا سبب یہ ہے کہ لوگوں کو روحانیت کا پوائنٹ آف ریفرنس ہی نہ مل سکا۔ سائنسی انقلاب سے پہلے انسان غلط طور پر یہ سمجھتا تھا کہ انسان کے فکر و احساس کا مرکز اس کا قلب ہے، اس لیے قدیم زمانے میں تمام روحانی عمل کا مرکز انسان کا قلب بنا رہا۔

مراقبہ اور میڈیٹیشن جیسی روحانی ورزشیں جو قدیم زمانے میں جاری ہوئیں وہ سب مبنی بر قلب ورزشیں تھیں۔ مگر جیسا کہ آج ہم جانتے ہیں انسان کا دل صرف گردشِ خون کا ذریعہ ہے، وہ فکر و احساس کا مرکز نہیں۔ اس لیے انسان کی تمام روحانی ورزشیں بے فائدہ ورزشیں بن کر رہ گئیں، وہ انسان کے لیے تعمیرِ شخصیت کا ذریعہ نہ بن سکیں۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ مسلسل طور پر کسی چیز پر اپنی توجہ مرتکز کی جائے تو اس کے اندر ایک مجہول اہتزاز کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کو وجد (ecstasy) کہا جاتا ہے۔ یہ گویا ایک قسم کی ذہنی تخدیر ہے۔ قلب پر مبنی روحانی ورزشوں کے دوران آدمی کے اندر اسی قسم کی وجد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے لوگوں نے بے خبری کی بنا پر اسی مجہول وجد کو روحانیت کا حاصل سمجھ لیا۔ حتیٰ کہ روحانیت اور وجد دونوں ایک دوسرے کے ہم معنی الفاظ بن گیے۔ اس بنا پر ایسا ہوا کہ روحانیت کا علم وجد کی نچلی سطح پر رک کر رہ گیا، وہ فکری ارتقاء کے درجے تک نہ پہنچ سکا۔

قبل سائنسی دَور میں انسان نے بہت سی چیزوں کے معاملے میں غلط تصورات قائم کر لیے تھے۔ سائنسی انقلاب کے بعد انسان چیزوں کے بارے میں زیادہ صحیح معلومات تک پہنچ سکا۔ اس کے بعد انسان نیے علمی دَور میں جینے لگا۔ مثلاً قبل سائنس دَور میں چاند کو روشن کُرہ سمجھا جاتا تھا، مگر بعد سائنس دَور میں جو معلومات حاصل ہوئیں ان کے بعد اب چاند کو ایک غیر روشن کرہ مانا جاتا ہے۔

یہی معاملہ قلب کا ہے۔ قبل سائنس دَور میں قلب کو فکر و خیال کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اِس بنا پر ہر جگہ مبنی بر قلب روحانیت کا روج ہو گیا۔ اب بعد سائنس دَور میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ انسان کا

قلب صرف گردشِ خون کو جاری رکھنے کا ذریعہ ہے۔ ایسی حالت میں ضرورت ہے کہ روحانیت کے علم کو بدلا جائے۔

اب روحانیت کے علم کو از سرِ نو مُدَوّن کرنے کی ضرورت ہے۔ ضرورت ہے کہ روحانیت کے علم کو دماغ کے ساتھ جوڑا جائے۔ روحانی ترقی کو تفکیری عمل کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیوں کہ روحانی ترقی کا سرچشمہ دماغی عمل ہے نہ کہ قلبی ورزش۔

اِس مقصد کے لیے ہر عورت اور مرد کو مسلسل طور پر دو کام کرنا ہے۔ ایک یہ کہ اپنے حافظے کے خانے میں جو منفی آئٹم جمع ہو گیے ہیں ان کو دوبارہ نکال کر انھیں مثبت آئٹم میں تبدیل کرنا۔ یعنی وہی عمل جس کو بعض جانور جُگالی کی صورت میں کرتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ہر دن جو واقعات ہوتے ہیں ان کو فوراً ہی مثبت آئٹم میں ڈھالنا تاکہ زندہ شعور سے نکل کر جب وہ لاشعور یا حافظے کے خانے میں جائیں تو وہ وہاں منفی آئم کے طور پر ذخیرہ نہ ہوں بلکہ مثبت آئٹم کے طور پر ذخیرہ ہوں۔

مثال کے طور پر ایک مصنف ہے۔ آپ کے ذہن میں اس کی منفی تصویر بنی ہوئی ہے، آپ اس کو ایک گمراہ مصنف سمجھنے لگے ہیں۔ اب اِس معاملے میں روحانی عمل یہ ہے کہ اس مصنف کے بارے میں جو منفی تصور آپ کے ذہن میں بن گیا ہے، اس کو جگالی کر کے اپنے ذہن سے نکالیں اور پھر اس کے بارے میں اپنے تصور کو دوبارہ بے لاگ طور پر جانچیں۔ اگر اس جائزے میں یہ معلوم ہو کہ مذکورہ مصنف کے بارے میں آپ کے منفی رائے صرف اِس تعصب کی بنا پر بنی تھی کہ وہ مصنف آپ کی محبوب شخصیت پر تنقید کرتا تھا۔ اگر ایسا ہو تو آپ کے لیے اِس معاملے میں روحانی عمل یہ ہوگا کہ آپ اس شخص کے بارے میں اپنے تصور کو مکمل طور پر بدلیں۔ اس کے کیس کو ایک علمی کیس سمجھیں نہ کہ گمراہی کا کیس۔

اِس طرح ہر روحانی انسان کو یہ کرنا ہوگا کہ وہ اپنے اندر داخل ہونے والے ایک ایک خیال کو جانچے اور کامل غیر جانب داری کے ساتھ اپنے آپ پَر تنقید کر کے اپنی رائے کو بدلے۔ اِس معاملے میں آدمی کو اتنا زیادہ حساس ہونا چاہیے کہ اگر بالفرض اس کو دوسرا انسان بظاہر غلط نظر آتا ہے تب بھی وہ

اس کے بارے میں ایسی توجیہہ تلاش کرے جو مذکورہ شخص کے بارے میں اس کے منفی احساس کوختم کرنے والی ہو۔

ایسا کرنا خود اپنی حفاظت کے لیے ضروری ہے۔ ہر انسان کو یہ جاننا چاہیے کہ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ دوسرا شخص آپ کو درست نظر آنے لگے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی اپنی شخصیت مکمل طور پر مثبت شخصیت بن سکے۔ آپ کے حافظے میں کوئی ایک بھی منفی آئٹم باقی نہ رہے۔ آپ کا حافظہ صرف مثبت آئٹم کا ذخیرہ بن چکا ہو۔

اسپریچول ڈیولپمنٹ دراصل انٹلکچول ڈیولپمینٹ کا دوسرا نام ہے۔ انٹلکچول ڈیولپمنٹ کے عمل کا آغاز ذہن کی ری انجینیرنگ سے ہوتا ہے۔ ہر آدمی کسی ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ ماحول کی نسبت سے مسلسل اس کی کنڈیشننگ ہوتی رہتی ہے۔ آدمی کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے کنڈیشنڈ مائنڈ کی ڈی کنڈیشننگ کرے۔ یہی اِس معاملے میں روحانی سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہر آدمی فطری طور پر روحانی انسان ہی ہوتا ہے۔ وہ خدا کی طرف سے ربّانی شخصیت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی روحانیت کو زندہ کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کی فطرت کے اوپر پڑے ہوئے پَردوں کو ہٹا دیا جائے۔ ان مصنوعی پَردوں کو ہٹانے کے بعد جو چیز باقی رہے گی وہ وہی ہوگی جس کو روحانی شخصیت یا ربّانی شخصیت کہا جاتا ہے۔

انٹلکچول ڈیولپمنٹ سے مراد ذہن کی اُس استعداد کو زندہ کرنا اور اس کو ترقی دینا ہے جو اپنے خالق کا شعور لیے ہوئے ہے۔ اِسی شعورِ رب کو بیدار کرنے کا نام روحانیت ہے۔ روحانیت کوئی پُر اسرار چیز نہیں، وہ فطرتِ انسانی میں چھپے ہوئے شعورِ خداوندی کو اَن فولڈ (unfold) کرنے کا دوسرا نام ہے۔ یہ مکمل طور پر ایک شعوری بیداری کا معاملہ ہے نہ کہ کسی قسم کے پُراسرار وجد کا مبہم تجربہ کرنے کا معاملہ۔

روحانیت وہی چیز ہے جس کو قرآن میں ربّانیت (آل عمران ۷۹) کہا گیا ہے۔ یعنی خدارخی زندگی (God oriented life) گذارنا۔ خدا کو اپنی زندگی کا واحد مرکز ومحور بنا لینا۔ روحانیت اُس حالت کا

نام ہے جب کہ انسان کی سوچ، اس کے جذبات اور اس کا عمل، سب خدا کے رنگ میں رنگ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ روحانیت ایک شعوری یافت ہے نہ کہ مبہم قسم کی کوئی وجدانی یافت۔ انسان کے اندر اعلیٰ ترین صفت، شعور کی صفت ہے۔ انسان کے لیے صرف وہی چیز اہم ترین چیز بن سکتی ہے جس کی یافت اس کو شعوری سطح پر ہوئی ہو۔

شعور اور وجدان میں یہ فرق ہے کہ شعور ایک معلوم ذہنی حالت کا نام ہے جب کہ وجدان ایک مبہم قلبی حالت کا نام ہے۔ روحانیت کو ایک وجدانی تجربہ سمجھنا روحانیت کی تصغیر ہے۔ اعلیٰ روحانیت وہ ہے جو آدمی کے لیے ذہنی طور پر ایک معلوم تجربہ بن جائے۔ حقیقی روحانیت وہ ہے جو شعور کو متحرک کر کے حاصل ہو۔ وجدان کے تجربے میں اس قسم کی شعوری صفت نہیں پائی جاتی۔

باب چہارم

جنت کا پیشگی تعارف

انسان بے شمار خواہشیں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہ خواہشیں اس کی زندگی کا سب سے زیادہ حسین سرمایہ ہوتی ہیں۔ آدمی ان خواہشوں کی تکمیل کے لیے ساری عمر دوڑتا رہتا ہے۔ آخر کار ہر آدمی صرف یہ دریافت کرتا ہے کہ وہ اپنی خواہشوں کو پورا نہ کرسکا۔ ہر آدمی کا یہ مقدر ہے کہ وہ خواہشوں کی تکمیل سے پہلے بھی غیر مطمئن ہو اور بظاہر خواہشوں کی تکمیل کے بعد بھی غیر مطمئن رہے۔ یہ انجام ہر ایک کے لیے مقدر ہے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔

اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی خواہشیں لامحدود ہیں، جب کہ موجودہ دنیا ایک محدود دنیا ہے۔ اس فرق نے اس بات کو ناممکن بنا دیا ہے کہ کوئی شخص موجودہ دنیا میں اپنی خواہشوں کا محل تعمیر کرسکے۔ اس دنیا میں خواہشوں کے ہر محل کا انجام یہی ہونا ہے کہ آخر کار وہ خواہشوں کا قبرستان ثابت ہو۔ تاہم انسانی خواہشوں کا ایک مثبت رول ہے۔ یہ خواہشیں دراصل جنت کا پیشگی تعارف ہیں۔ یہ خواہشیں بتاتی ہیں کہ جنت کی وہ دنیا کتنی پُرمسرت دنیا ہوگی جہاں یہ تمام حسین خواہشیں مکمل طور پر پوری ہوں۔

موجودہ دنیا میں کامیابی کا راز خواہشوں کی تنظیم (desire management) ہے نہ کہ خواہشوں کی تکمیل کی ناکام کوشش۔ موجودہ دنیا اس لیے نہیں ہے کہ یہاں آدمی اپنی جنت تعمیر کرے۔ یہ دنیا صرف اس لیے ہے کہ یہاں آدمی اپنے حسنِ عمل سے اپنے آپ کو جنت میں داخلے کا اہل ثابت کرے۔ ان خواہشوں کو اگر مثبت مفہوم میں لیا جائے تو وہ جنتی عمل کے لیے گہرے محرک کا کام کرنے والی ثابت ہوں گی۔

ہماری خواہشیں (desires) ہماری کوشش کے رُخ کو بتاتی ہیں، وہ ہماری کوشش کی منزل کو نہیں بتاتیں۔ تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ منزل قابلِ حصول ہی نہیں۔ ہر آدمی کی زندگی کی ایک ہی داستان ہے۔ اور وہ ہے خواہشوں کی تکمیل کے پیچھے دوڑنا اور خواہشوں کی تکمیل کے بغیر مر جانا۔

مزید مطالعہ بتاتا ہے کہ کسی خواہش کی تکمیل کے لیے اتنے زیادہ عوامل درکار ہیں کہ اُن عوامل کو

یکجا کرنا انسان کے بس ہی میں نہیں، خواہ اس کو ایک ہزار سال کی عمر مل جائے اور ساری دنیا کی دولت اور اقتدار اس کے کنٹرول میں ہوں۔ مثلاً انسان ایک گھر بنا سکتا ہے مگر وہ یہ نہیں کرسکتا کہ زمین میں زلزلے کی آمد کو روک دے۔ انسان اعلیٰ اہتمام کے ذریعے صحت مند جسم بنا سکتا ہے مگر اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ موت کے قانون کو بدل دے۔ انسان ہر قسم کی لذّتوں کو اپنے گرد جمع کرسکتا ہے، مگر اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ لذتوں سے محظوظ ہونے کے بارے میں وہ اپنی محدودیت کو ختم کردے۔ انسان آسودگی کے ظاہری سامان اپنے گرد اکھٹا کرسکتا ہے مگر وہ فطرت کے اُس قانون کو بدل نہیں سکتا جس کے تحت انسان کو بیماری اور حادثات جیسی چیزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

اس تجربے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے بس میں صرف کرنا ہے، انسان کے بس میں نتیجہ نہیں۔ کرنے کا اختیار انسان کو ہے مگر کرنے کے نتیجے میں ایک نئی دنیا کی تعمیر کا اختیار خالق کے سوا اور کسی کو نہیں۔ ایسی حالت میں جو شخص کرنے کے ساتھ یہ چاہتا ہے کہ وہ نتیجے کا محل بھی بنا ڈالے، وہ صرف غیر حقیقت پسندی کا ثبوت دے رہا ہے اور غیر حقیقت پسندانہ سوچ کے تحت دنیا میں کوئی حقیقی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔

اِس حقیقت کو سامنے رکھ کر سوچیے تو صحیح بات یہ نظر آتی ہے کہ انسان اپنے اور خالق کے درمیان اس تقسیم پر راضی ہوجائے کہ کرنا میرا معاملہ ہے اور اس کا نتیجہ پیدا کرنا خالق کا معاملہ۔ اِس قانون کے مطابق، موت سے پہلے کا زمانہ انسان کے لیے عمل کرنے کا زمانہ ہے اور موت کے بعد کا زمانہ خالق کی طرف سے عمل کا انجام پانے کا زمانہ۔

آدمی اگر اس حقیقت کا اعتراف کرلے تو اس کو بیک وقت دو فائدے حاصل ہوں گے۔ اوّل یہ کہ اس کا ٹینشن ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گا۔ ٹینشن نام ہے عمل اور نتیجے کے درمیان فرق کا۔ اور جب یہ فرق ختم ہوجائے تو ٹینشن بھی اپنے آپ ختم ہوجاتا ہے۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو اس بات کی یقینی ضمانت حاصل ہوجائے کہ موت کے بعد وہ اپنے عمل کا مطلوب انجام اس طرح پالے گا کہ ہمیشہ کے لیے وہ خوشیوں کے ایک صدا بہار باغ کا مالک بن جائے۔

آئڈیل دنیا

جٹ ایرویز کی فلائٹ میگزین (Jet Wings) کے شمارہ اپریل ۲۰۰۵ء میں ایک مضمون چھپا تھا، جس کا عنوان یہ تھا— روڈ ٹو پیراڈائز:

The Road to Paradise

سات صفحے کے اس باتصویر مضمون میں اُس کے رائٹرس (Gustasp and Jeroo Irani) نے بتایا ہے کہ انھوں نے انڈیا کے اَروناچل پردیش کے خوبصورت پہاڑی علاقے کا سفر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہمالیہ کی اِس بلند دنیا میں ہر طرف فطرت کا حسن وافر مقدار میں موجود ہے۔ مگر اس علاقے میں سفر کرتے ہوئے بار بار تلخ تجربے بھی ہوتے ہیں۔ یہ علاقہ دُور سے دیکھنے میں تو بہت حسین معلوم ہوتا ہے لیکن وہاں کے راستوں میں چلنا اور وہاں کے مسائل سے نمٹنا پھول میں کانٹے کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ ان تجربات کا تذکرہ کرتے ہوئے اُنھوں نے لکھا تھا کہ ''ہر جنت کا ایک سانپ ہوتا ہے:

Every Paradise has its serpent.

یہ مَثل بائبل کی ایک کہانی پَر مبنی ہے۔ اِس کہانی کے مطابق، آدم کی جنت میں ایک سانپ بھی موجود تھا۔ مگر یہ کہانی درست نہیں۔ خدا کی بنائی ہوئی ابدی جنت میں کوئی ''سانپ'' نہیں۔ البتہ انسان بطورِ خود اپنے لیے جو عارضی جنتیں بناتا ہے ان میں سے ہر جنت میں ضرور ''سانپ'' موجود ہوتے ہیں۔ انسان کی بنائی ہوئی کوئی بھی جنت سانپ سے خالی نہیں۔

اصل یہ ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی ابدی جنت تو ایک آئیڈیل جنت ہے۔ وہاں نہ حال کی کوئی تکلیف ہے اور نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔ وہاں نہ کوئی ڈِس ایڈوانٹیج ہے اور نہ کوئی محدودیت۔ وہاں نہ شور ہے اور نہ کسی قسم کی کثافت (pollution)۔ وہاں نہ فساد ہے اور نہ کوئی تشدّد۔ یہ مکمل معنوں میں ایک معیاری جنت ہے۔

یہ ابدی جنت اس لیے بنائی گئی ہے تاکہ منتخب لوگوں کو وہاں بسایا جائے۔ انسانوں میں سے جو افرادِ اعلیٰ خدائی معیار پَر پورے اُتریں اُن کو یہ جنت مَوت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں انعام کے

طور پر دی جائے گی۔ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اس سے نکلنا نہ چاہیں گے۔اس ابدی جنت کی طلب ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہے۔ ہر آدمی عین اپنی فطرت کے زور پر اس جنت کا طالب ہے۔ وہ ہر قیمت پر اس کو پانے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔موت سے پہلے کی زندگی میں ہر عورت اور مرد اسی خوابوں والی جنت کو بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ ہر عورت اور مرد کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے خوابوں میں بسی ہوئی جنت کو بنائے اور اس کے اندر زندگی گذارے۔

مگر عملاً یہ ہوتا ہے کہ ہر عورت اور مرد کے حصے میں صرف جدو جہد آتی ہے، اس کا مطلوب نتیجہ کسی کے حصے میں نہیں آتا۔ ہر عورت اور مرد اپنی خوابوں والی جنت کو پانے میں اپنی ساری طاقت لگا دیتے ہیں مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے ڈریم لینڈ کو پائیں، اچانک ان کی موت آتی ہے اور وہ نا تمام آرزوؤں (unfulfilled wishes) کے ساتھ اگلی دنیا کی طرف چلے جاتے ہیں۔

کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ ہر آدمی یہ جانے کہ اس کی زندگی کے دو مَرحلے ہیں— قبل از موت مرحلۂ حیات اور بعد از موت مرحلۂ حیات۔ خالق نے جس چیز کو بعد از موت مرحلۂ حیات میں رکھ دیا ہو اس کو کوئی شخص قبل از موت مرحلۂ حیات میں پانے والا نہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو جاننے کا نام سچائی کی دریافت ہے۔ ہر عورت اور مرد کے لیے بہترین عقل مندی یہ ہے کہ وہ حیاتِ انسانی کے اِن دو مرحلوں کو جانیں اور اس کے مطابق اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔آج کی دنیا اپنے آپ کو مستحق بنانے کی جگہ ہے اور کل کی دنیا اپنے استحقاق کے مطابق اپنا انجام پانے کی جگہ۔ ہر عورت اور مرد کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ آج کی زندگی کو تیاری کا ایک موقع سمجھے۔ وہ اپنے وقت اور طاقت کا سب سے بڑا استعمال یہ سمجھے کہ وہ ابدی جنت میں داخلے کا خدائی معیار دریافت کرے۔ اور اِس دریافت کے مطابق اپنی زندگی کا نقشہ بنائے تاکہ جب اس کو موت آئے تو وہ خدا کی ابدی جنت کا لائق امیدوار (qualified candidate) قرار پائے۔

تقدیرِ انسانی

مشہور مسیحی مشنری بلی گراہم (Billy Graham) نے بتایا ہے کہ ایک بار وہ سفر میں تھے۔

اس دوران اُن کو ایک دولت مند امریکی کا پیغام ملا۔ اس پیغام میں کہا گیا تھا کہ فوراً مجھ سے ملو۔ بلی گراہم اپنا سفر ملتوی کر کے مذکورہ امریکی دولت مند کے پاس پہنچے۔

امریکی دولت مند کے گھر پہنچتے ہی اُن کو ایک علیٰحدہ کمرہ میں لے جایا گیا۔ یہاں مذکورہ امریکی دولتمند اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ ملاقات ہوئی تو امریکی دولت مند نے بلی گراہم سے کہا کہ تم دیکھتے ہو کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ زندگی نے اپنی تمام معنویت کھودی ہے۔ میں جلد ہی ایک نامعلوم دنیا کی طرف چھلانگ لگانے والا ہوں۔ نوجوان! کیا تم مجھ کو امید کی ایک کرن دے سکتے ہو:

> You see, I am an old man. Life has lost all meaning. I am going to take a fateful leaf into the unknown. Young man, can you give me a ray of hope.

یہ صرف ایک امریکی دولت مند کی کہانی نہیں، بلکہ یہ تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ ہر آدمی خواہ وہ امیر ہو یا غریب، خواہ وہ چھوٹا آدمی ہو یا بڑا آدمی۔ ہر شخص آخر کار اِسی احساس سے دوچار ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے لیے ایک پسندیدہ دنیا بنانا چاہتا ہے۔ وہ اپنا سارا وقت اس میں لگا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی مختصر زندگی کا آخری وقت آ جاتا ہے اور وہ اِس احساسِ مجبوری کے ساتھ اس دنیا سے چلا جاتا ہے کہ وہ جو کچھ پانا چاہتا تھا اس کو وہ پا نہ سکا۔

ایسا کیوں ہے۔ اس وسیع کائنات میں انسان واحد مخلوق ہے جو اپنے سینے میں بے شمار خواہشیں (desires) رکھتا ہے۔ کیا یہ خواہشیں اسی لیے ہیں کہ وہ کبھی پوری نہ ہوں اور ہر انسان خود اپنی خواہشوں کے قبرستان میں دفن ہو کر رہ جائے۔ ہر عورت اور مرد کے ذہن میں خوابوں کی ایک دنیا بسی ہوئی ہے۔ کیا سُہانے خوابوں کی یہ دنیا صرف اس لیے ہے کہ وہ محض خواب بن کر رہ جائے اور کبھی اُس کی تعبیر نہ نکلے۔ ہر انسان تمنّاؤں کا ایک باغ اپنے سینے میں اُگاتا ہے، مگر کسی انسان کو یہ خوشی نہیں ملتی کہ وہ اس خوبصورت باغ میں داخل ہو سکے۔

فطرت میں یہ تضاد کیوں ہے۔ انسان کے سوا وسیع کائنات میں ایسا تضاد کہیں موجود نہیں۔ نباتات، جمادات اور حیوانات کی پوری دنیا اس قسم کے تضاد سے مکمل طور پر خالی ہے۔ پھر یہ تضاد استثنائی

طور پر صرف انسان کی زندگی میں کیوں پایا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان اور کائنات کی دوسری چیزوں کے درمیان ایک بے حد بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ انسان کی زندگی کے دو مرحلے ہیں — موت سے پہلے کا مرحلۂ حیات اور موت کے بعد کا مرحلۂ حیات۔ اس کے برعکس کائنات کی بقیہ تمام چیزوں کا صرف ایک مرحلہ ہے یعنی وجود میں آنا اور پھر ایک دن مٹ جانا، پیدا ہونا اور پھر مرکر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا۔

اصل یہ ہے کہ انسان جو کچھ اپنے پہلے مرحلۂ حیات میں پانا چاہتا ہے وہ اس کے لیے دوسرے مرحلۂ حیات میں مقدر کیا گیا ہے۔ اور جو چیز سفرِ حیات کے اگلے مرحلے میں ملنے والی ہو وہ سفرِ حیات کے ابتدائی مرحلے میں کبھی کسی کو نہیں ملتی۔ اس صورت حال کا سبب یہ ہے کہ انسان کے لیے فطرت کا ایک خصوصی قانون ہے جو اس کائنات کی دوسری چیزوں کے لیے نہیں۔ وہ یہ کہ انسان کی زندگی کو عمل اور جزا کے اُصول کے تحت رکھا گیا ہے۔ یعنی موت سے پہلے کے مرحلۂ حیات میں عمل کرنا اور موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں اس کا انجام پانا۔

یہی قانون انسان کی زندگی کے معاملے کو سمجھنے کے لیے کلید کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قانون کو سمجھنے کے بعد انسان کی پوری زندگی بامعنٰی بن جاتی ہے۔ یہ قانون انسان کی زندگی کے تمام سوالات کا کامل جواب فراہم کرتا ہے۔ اس قانون کو جاننے کے بعد پوری انسانی زندگی کی تشفی بخش توجیہہ مل جاتی ہے۔ اس قانون کے مطابق، موت سے پہلے کی دنیا انسان کے بیج ڈالنے کا مرحلہ ہے اور موت کے بعد کی دنیا اس کے نتیجے میں ہرا بھرا درخت اور پھول و پھل پانے کا مرحلہ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ موجودہ دنیا میں پھول اور پھل حاصل کرنے کی لاحاصل کوشش نہ کرے بلکہ وہ اپنی ساری توجہ بہترین طور پر تخم ریزی میں لگا دے۔ یہ وہ انسان ہے جو موت کے بعد کی دنیا میں جنت کی صورت میں وہ سب کچھ پالے گا جس کو وہ موت سے پہلے کی دنیا میں نہ پا سکا تھا۔

مادّی ترقی کا سراب

موجودہ دنیا میں مادی ناکامی بھی اُتنی ہی بے معنیٰ ہے جتنا کہ مادی کامیابی۔ اس کی مثالیں برابر مختلف صورتوں میں سامنے آتی رہتی ہیں۔ مثلاً بمبئی میں ۲۹ جولائی ۲۰۰۴ کو یہ واقعہ ہوا کہ ۲۵ سالہ

مِس انڈیا نفیسہ جوزف نے اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ حالاں کہ اس وقت وہ نہایت کامیاب ماڈل بنی ہوئی تھیں۔ اُن کا یہ قول خود اُن کے اوپر صادق آیا کہ مشہور ہونا گویا پانی کے بلبلے میں رہنا ہے جو کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتا ہے:

Being famous is like living in a bubble that can burst any moment.

اسی بمبئی سے ایک اور زیادہ اہم خبر آئی ہے جو انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (نئی دہلی) کے شمارہ ۲۲ اگست ۲۰۰۴ میں چھپی ہے۔ یہ مشہور صنعت کار جگی لال کملاپت سنگھانیہ کے پوتے گوتم سنگھانیہ کا انٹرویو ہے جو مذکورہ اخبار کے ضمیمہ (Times Life) کے صفحہ اول پر نمایاں طور پر چھپا ہے۔

مسٹر گوتم سنگھانیہ ہندستان کے بڑے صنعت کاروں میں سے ایک ہیں۔ مگر دولت نے اُنھیں خوشی نہیں دی۔ دولت کے انبار میں رہتے ہوئے وہ مکمل طور پر بے سکونی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ بمبئی میں اپنی بظاہر آرام دہ رہائش گاہ میں بیٹھ کر اُنھوں نے ٹائمس آف انڈیا کے نیوز نیٹ ورک سے ملاقات میں یہ باتیں کہیں۔

گوتم سنگھانیہ بظاہر تمام مادی چیزوں کے مالک ہیں — ایک ہزار کروڑ کی ایمپائر کا ورثہ، کئی ہوائی جہاز، کاریں، تفریحی کشتی، وغیرہ (مگر ان سب کے باوجود گوتم سنگھانیہ کو ۴۱ سال کی عمر میں بھی خوشی حاصل نہیں)۔ میں دنیا کے دس ایسے آدمیوں کے نام لے سکتا ہوں جو اتھاہ دولت کے مالک ہیں مگر وہ انتہائی غمگین زندگی گذار رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت، شہرت، اقتدار، یہ چیزیں آپ کو خوشی نہیں دے سکتیں:

The son of Vijaypat Singhania had it all, a thousand crore empire to inherit, planes, cars, yachts. I can name 10 people who have all the money in the world, but are miserable. So, money, fame, power—these things can't make you happy.

اصل یہ ہے کہ ہر انسان اپنے ذہن میں ایک پُرمسرت دنیا (جنت) کا حسین تصور پیدائشی طور پر لیے ہوئے ہے۔ وہ اپنی ساری طاقت استعمال کر کے دولت کماتا ہے تاکہ وہ اپنے تخیل کے مطابق،

یہ حسین دنیا بنا سکے۔ مگر مادی اعتبار سے جب وہ سب کچھ حاصل کر چکا ہوتا ہے تو اُس پر منکشف ہوتا ہے کہ اُس کی بنائی ہوئی جنت میں اُس کو حقیقی سکون حاصل نہیں۔

یہ کم وبیش ہر انسان کا حال ہے۔ ہر انسان خود اپنے بنائے ہوئے خوبصورت مادی قبرستان میں دفن ہو رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی مطلوب دنیا لامحدود راحتوں کی دنیا ہے۔ ایسی دنیا موجودہ محدود عالم میں بن نہیں سکتی۔ وہ صرف موت کے بعد آنے والی دنیا میں بن سکتی ہے۔ یہ اگلی دنیا لامحدود بھی ہے اور ابدی بھی۔ اسی کے ساتھ یہ ہوگا کہ انسان جب اگلی دنیا میں پہنچے گا تو اس کو ایک نیا وجود دیا جائے گا جو ہر قسم کی کمیوں سے پاک ہوگا۔

موجودہ دنیا میں اگر کوئی شخص اپنے لیے کامیاب زندگی کا نقشہ بنانا چاہتا ہے تو اس کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ اس معاملے میں خدا کا تخلیقی نقشہ (creation plan) کیا ہے۔ اس دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر خدا کے تخلیقی نقشے کی موافقت کر کے ہوسکتی ہے۔ خدا کے تخلیقی نقشے کو نظر انداز کر کے کوئی شخص یہاں اپنے لیے کامیاب زندگی نہیں بنا سکتا۔

خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، موت سے پہلے کی عارضی دنیا صرف امتحان کے لیے ہے۔ اس نقشہ کے مطابق، مطلوب زندگی کی تعمیر صرف موت کے بعد کی زندگی میں ممکن ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ کوشش کرے کہ وہ موت سے پہلے کے امتحان میں اپنے آپ کو کامیاب بنائے تاکہ وہ موت کے بعد کے مرحلۂ حیات میں خدائی انعام کے طور پر اپنی مطلوب دنیا حاصل کر سکے۔ کامیاب زندگی کی تعمیر کا یہی واحد اصول ہے۔

آج کی دُنیا اور اگلی دُنیا

بیج ڈالنے کے دن جو کسان فصل کاٹنا چاہے، وہ بیج کو بھی کھوئے گا اور فصل سے بھی محروم رہے گا۔ یہی معاملہ آج کی دنیا اور موت کے بعد آنے والی کل کی دنیا کا ہے۔ آج کی دنیا عمل کرنے کی جگہ ہے اور کل کی دنیا انعام پانے کی جگہ۔ جو شخص آج کی دنیا ہی میں ''انعام'' حاصل کرنا چاہے تو وہ اس قیمت پر ہوگا کہ وہ مطلوب عمل انجام نہ دے سکے گا۔ وہ اگلی دنیا کی تعمیر کے واحد موقع کو کھو دے گا۔

جو چیز اگلی دنیا میں ملنے والی ہے اس کو آدمی موجودہ دنیا میں پانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دونوں ہی کو کھو دیتا ہے۔ عقل مند انسان وہ ہے جو آج کی دنیا کے ذریعے کل کی دنیا کو خرید ے، نہ کہ وہ آج کی دنیا میں پھنس کر اگلی دنیا میں اپنے آپ کو محروم بنالے۔

آپ سفر کے دوران وہ سکون حاصل کرنا چاہیں جو صرف گھر پر کسی آدمی کو ملتا ہے تو آپ کبھی اپنی اس طلب میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسی مثال سے آج کی دنیا اور کل کی دنیا کے معاملے کو سمجھا جاسکتا ہے۔ آج کی دنیا کو خدا نے عمل کرنے کی جگہ بنایا ہے اور کل کی دنیا کو عمل کا انجام پانے کی جگہ۔ آج کی دنیا سفر کا راستہ ہے اور کل کی دنیا اِس سفر کی آخری منزل۔

اب اگر آپ چاہیں کہ آج کی دنیا ہی میں اپنا انجام پالیں تو آپ کے عمل کی منصوبہ بندی بالکل غلط ہو جائے گی۔ اِسی طرح اگر آپ راستے میں منزل والا سکون حاصل کرنا چاہیں تو آپ اپنے راستے کو کھوٹا کرلیں گے۔ عقل مند آدمی وہ ہے جو آج کی دنیا اور کل کی دنیا کے اِس فرق کو سمجھے۔ وہ موت سے پہلے اُس چیز کی خواہش نہ کرے جو صرف موت کے بعد والی زندگی میں کسی کو مل سکتی ہے۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ حقیقت پسند بنے۔ وہ خواہشوں کے پیچھے نہ دوڑے۔ کیوں کہ خواہشیں آدمی کو تباہی کے سوا کسی اور انجام تک پہنچانے والی نہیں۔

ہر آدمی اپنے سینے میں خواہشات کا ایک سمندر لئے ہوئے ہے۔ یہ خواہشات بجائے خود غلط نہیں۔ مگر ان خواہشات کی تکمیل کا مقام کل کی دنیا ہے نہ کہ آج کی دنیا۔

دارالعمل دارالجزاء

دنیادارالعمل ہےاورآخرت دارالجزاء۔یعنی دنیاعمل کرنے کی جگہ ہےاورآخرت اس عمل کے مطابق بدلہ پانے کی جگہ۔ ہرعورت اورمرداپنی زندگی کاابتدائی بہت تھوڑاحصہ موجودہ دنیامیں گزارتے ہیں اورپھرموت کے بعدوہ اگلی دنیامیں پہنچادیے جاتے ہیں جہاں ان کواپنے عمل کےمطابق ،یاجنت میں جگہ ملےگی یاجہنم میں۔

اس اعتبار سےموجودہ دنیاامتحان کی جگہ ہے۔امتحان حال ہمیشہ ٹسٹ کے لیے ہوتا ہے نہ کہ ٹسٹ کا رزلٹ پانے کے لیے۔ جو طالب علم امتحان حال میں جاب حاصل کرنا چاہے وہ یقینی طور پر ناکام رہے گا۔اسی طرح جوشخص موجودہ دنیامیں اپنے لیےخوشیوں کاابدی محل بنانا چاہے وہ بھی اپنے مقصودکونہیں پائے گا۔کیوں کہ موجودہ دنیااس مقصدکے لیے بنائی ہی نہیں گئی۔

عقلمندآدمی وہ ہے جواس فرق کوسمجھےاوروہ دنیامیں وہ کرے جواس کویہاں کرنا ہے،اورآخرت کے لیےوہ چیز چاہے جووہاں کسی خوش نصیب شخص کوملنےوالی ہے۔

اس معاملے میں عقلمندآدمی ٹھیک اسی اصول کواختیارکرتا ہےجس کوطالب علم اختیارکرتا ہے۔ طالب علم جب امتحان حال میں ہوتا ہےتووہ اپنی ساری توجہ اس طرف لگادیتا ہے کہ وہ اپنے ٹسٹ پیپرکو صحیح طورپرکرسکےوہ امتحان حال میں اپنامعاشی محل بنانے کی کوشش نہیں کرتا۔

ٹھیک یہی حال ہرانسان کا دنیااورآخرت کی نسبت سے ہونا چاہیے۔ ہرانسان کوچاہیے کہ وہ موت سے پہلے کی مختصرزندگی کوآخرت کی تیاری میں لگائے تاکہ موت کے بعد کے دورِحیات میں وہ اپنے لیےخوشیوں کی دنیاپاسکے۔اگرکوئی عورت یامردموجودہ دنیامیں اس اعتبار سے غافل رہے تواگلی دنیامیں اس کی تلافی ممکن نہ ہوگی،حتی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ وہ لوٹ کردوبارہ موجودہ دنیامیں آئے اور آخرت کی نسبت سےدوبارہ اپنی تعمیرکرے۔

موت کے بعد آنے والی دنیا کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے ہی کا نام روحانیت ہے۔ روحانیت زندگی کا وہ شعبہ ہے جس کے ذریعے آدمی اپنی شخصیت کی ربانی تعمیر کرتا ہے۔روحانیت

کے ذریعے وہ اپنے آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ موت کے بعد آنے والی دنیا میں وہ وہاں کا ایک کامیاب شہری بن سکے۔ روحانیت گویا مذہب کا خلاصہ ہے۔ روحانیت وہ تربیت گاہ ہے جہاں لوگ اس قابل بنائے جاتے ہیں کہ وہ موت کے بعد آنے والے دورِ حیات میں اپنے لیے ایک اعلیٰ مقام پاسکیں۔

روحانی ترقی

روحانی ترقی کیا ہے۔ روحانی ترقی اپنی داخلی شخصیت میں ربّانی بیداری لانے کا دوسرا نام ہے۔ مادی خوراک انسان کے جسمانی وجود کو صحت مند بناتی ہے۔ اسی طرح انسان کا روحانی وجود ان لطیف تجربات کے ذریعے صحت مند بنتا ہے جن کو قرآن میں رزقِ رب (ربّانی خوراک) کہا گیا ہے۔

۱۶ جولائی ۲۰۰۴ کا واقعہ ہے۔ اس دن دہلی میں سخت گرمی تھی۔ دوپہر بعد دیر تک کے لیے بجلی چلی گئی۔ چھت کا پنکھا بند ہوگیا۔ میں اپنے کمرے میں سخت گرمی کی حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ دیر تک میں اسی حالت میں رہا یہاں تک کہ بجلی آگئی اور پنکھا چلنے لگا۔

یہ ایک اچانک تجربے کا لمحہ تھا۔ پنکھا چلتے ہی جسم کو ٹھنڈک ملنے لگی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اچانک مصیبت کا دور ختم ہوگیا اور اچانک راحت کا دوسرا دور آگیا۔ اس وقت مجھے پیغمبر اسلام کی وہ حدیثیں یاد آئیں جن میں بتایا گیا ہے کہ دنیا مومن کے لیے مصیبت کی جگہ ہے۔ جب مومن کی موت آئے گی تو اچانک وہ اپنے آپ کو جنت کے باغوں میں پائے گا۔ دنیوی زندگی کا پُرمصیبت دور اچانک ختم ہوجائے گا اور عین اسی وقت پُر راحت زندگی کا دور شروع ہوجائے گا۔

جب یہ تجربہ گزرا تو میری فطرت میں چھپے ہوئے ربّانی احساسات جاگ اٹھے۔ مادی واقعہ روحانی واقعے میں تبدیل ہوگیا۔ میرے دل نے کہا کہ کاش، خدا میرے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرمائے۔ جب میرے لیے دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آئے تو وہ ایک ایسا لمحہ ہو جو اچانک دورِ مصیبت سے دورِ راحت میں داخلے کے ہم معنٰی ہوجائے۔

روحانیت دراصل ایک ذہنی سفر ہے، ایک ایسا سفر جوآدمی کو مادیت سے اوپر اُٹھا کر معنویت تک پہنچا دے۔ یہ سفر داخلی سطح پر ہوتا ہے۔ دوسرے لوگ بظاہر اس سفر کونہیں دیکھتے لیکن خود مسافر انتہائی گہرائی کے ساتھ اس کومحسوس کرتا ہے۔ روحانیت انسان کوانسان بناتی ہے۔جس آدمی کی زندگی روحانیت سے خالی ہواُس میں اورحیوان میں کوئی فرق نہیں۔

جنت کی زندگی

جاپان کے سفر (دسمبر ۱۹۹۰) میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ میں نے کہا کہ موجودہ دنیا عارضی جگہ ہے اور آخرت ابدی قیام کی جگہ۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی ''جنت'' ابدی دنیا میں تعمیر کرے۔ انھوں نے کہا: انسان کسی راحت یا لذت کی چیز سے تھوڑی دیر کے بعد اکتا جاتا ہے۔ چنانچہ جدید ترقی یافتہ دنیا میں بہت بڑے پیمانے پر اکتاہٹ (boredom) کا مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔ ایسی حالت میں ابدی جنت سے کیا فائدہ۔

جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ ہمیشہ سے یہی بات کہتے آرہے ہیں۔ مگر یہ صرف ایک مغالطہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ اکتاہٹ استعداد تلذذ کے خاتمے کی بنا پر آتی ہے نہ کہ خواہش تلذذ کے خاتمے کی بنا پر۔

ان حضرات نے یہ فرض کرلیا ہے کہ جب ہم کسی لذت سے انجوائے (enjoy) کرنا چاہتے ہیں تو کچھ دیر بعد اس سے ہمارا جی بھر جاتا ہے۔ اور پھر اس میں ہمارے لئے لذت باقی نہیں رہتی۔ مگر یہ مفروضہ بجائے خود غلط ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے اپنے اندر غیر تسکین پذیر فطرت (insatiable nature) رکھتا ہے۔ انسان کو جو چیزیں مرغوب ہیں، ان سے وہ ابدی طور پر لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔

مگر موجودہ دنیا میں انسان بے شمار محدودیتوں (limitations) کا شکار ہے۔ چنانچہ انسان جب بھی کسی مرغوب چیز سے انجوائے کرنا چاہتا ہے تو تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کی محدودیت اس کی راہ میں حائل ہوجاتی ہے۔ رغبت کے باوجود وہ اس چیز سے انجوائے کرنے کی طاقت کھودیتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم ایک لذیذ چیز کھاتے ہیں تو اس چیز کی لذت ہمارے لئے ختم نہیں ہوتی بلکہ ہمارا پیٹ بھر جاتا ہے، اس لئے ہم کو اسے چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ اسی طرح اکثر دولت مند لوگ رغبت کے باوجود کئی چیزوں کو کھانا چھوڑ دیتے ہیں، کیوں کہ انھیں اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ موٹے ہوکر طرح

طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جائیں گے۔

یہی حال تمام دوسری لذتوں کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکتاہٹ یا بے رغبتی ہماری انجوائے کرنے کی استعداد کی حد ہے نہ کہ خود رغبت کی حد۔

جنت وہ جگہ ہے جہاں نہ صرف یہ ہوگا کہ تمام لذتیں مزید اضافے کے ساتھ زیادہ مکمل حالت میں انسان کو دی جائیں گی، بلکہ ان لذتوں سے انجوائے کرنے کی استعداد کے سلسلے میں اس کی محدودیت بھی ختم کر دی جائے گی۔ جنت میں یہ تضاد ختم ہو جائے گا کہ آدمی انجوائے کرنا چاہتا ہے مگر اپنی کسی کمی کی بنا پر وہ اپنی مرغوب چیزوں سے انجوائے نہیں کر پاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جنت انسان کے لئے ابدی خوشیوں کی جگہ بن جائے گی۔

دنیا میں آدمی کو جس اکتاہٹ (بورڈم) کا تجربہ ہوتا ہے وہ دراصل ایک تضاد کا نتیجہ ہے۔ آدمی پیدائشی طور پر ایک معیار پسند (idealist) مخلوق ہے۔ وہ چیزوں کو ان کی آئیڈیل صورت میں پانا چاہتا ہے۔ مگر اس دنیا میں ہر چیز غیر معیاری یا غیر آئیڈیل ہے۔ یہاں بورڈم کا اصل سبب یہی ہے۔

آدمی اپنے شوق کے تحت ایک چیز کی طرف دوڑتا ہے۔ اس کو پانے سے پہلے وہ اس فریب میں رہتا ہے کہ یہ عین وہی آئیڈیل چیز ہے جس کا وہ طالب تھا۔ مگر حاصل کر لینے کے بعد جب وہ اس کا تجربہ کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز اس کے مطلوب آئیڈیل سے بہت کم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی کو تلاش کی لذت تو ملتی ہے مگر یافت کی لذت اس کو نہیں ملتی۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے لئے فریب لذت ہے اور آخرت میں حقیقی لذت۔ آخرت کی ہر چیز معیاری ہوگی۔ اس بنا پر وہ آدمی کے لئے حقیقی اور لامحدود لذت کا ذریعہ بن جائے گی۔ آدمی جو کچھ چاہتا ہے وہ جنت میں اس کو مزید اضافے کے ساتھ مل جائے گا، اس لئے وہاں اس کے لئے اکتاہٹ کا کوئی سوال نہ ہوگا۔

جنت کے دروازے پر

On the Threshold of Paradise

جنت کیا ہے۔ جنت کوئی پراسرار چیز نہیں۔ جنت دوسرے معلوم سائنسی واقعات کی طرح ایک معلوم سائنسی واقعہ ہے۔ جنت دراصل زمین کا کنورژن ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، زمین پہلے آگ کی صورت میں تھی۔ پھر وہ ٹھنڈی ہوکر موجودہ زمین بنی۔ گویا غیر زمین نے کنورٹ ہوکر زمین کی صورت اختیار کی۔ اسی طرح مستقبل میں ایک اوراعلیٰ درجے کا کنورژن ہوگا۔ اس وقت غیر جنتی زمین کنورٹ ہوکر جنتی زمین بن جائے گی۔

موجودہ دنیا میں تمام چیزیں کنورژن کے ذریعے وجود میں آتی ہیں۔ پانی کیا ہے، دو گیسوں کا کنورژن۔ درخت کیا ہے، غیر درخت کا کنورژن۔ مشین کیا ہے، لوہے کا کنورژن۔ صنعتی دنیا کیا ہے، غیر صنعتی دنیا کا کنورژن۔ اسی طرح مستقبل میں ایک زیادہ بڑا کنورژن پیش آئے گا۔ اس وقت موجودہ غیر معیاری زمین بدل کر معیاری زمین بن جائے گی، اسی کا نام مذہبی زبان میں جنت ہے۔ اس واقعے کی طرف قرآن میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: **یوم تبدل الارض غیر الارض** (ابراہیم ۴۸)

When the earth is turned into another earth.

زمین پر کنورژن کا یہ عمل بار بار پیش آیا۔ زمین کے لیے کنورژن ایک معلوم فطری پراسس ہے۔ وہ ایک معلوم فطری واقعہ ہے۔ ایسی حالت میں جنت کو ماننا صرف ایک ہونے والے واقعے کو ماننا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی فیکٹری کے بارے میں کہا جائے کہ اس سے ۹۹۹ پروڈکٹ نکل چکے ہیں اوراب اس سے ہزارواں پروڈکٹ نکلنے والا ہے۔

جنت صرف ایک مذہبی عقیدہ نہیں۔ خود فطرت کے محکم قانون کے مطابق، جنت ایک ہونے والا واقعہ ہے۔ فطرت کا نظام جس قانون کے تحت چل رہا ہے اُس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا مسلسل ایک ارتقائی عمل سے گذر رہی ہے۔ جنت گویا اسی ارتقائی عمل کی آخری اورانتہائی صورت ہے،

جو خدائی اہتمام کے تحت وجود میں آئے گی۔ جنت ایک تخلیقی آغاز کی فطری انتہا ہے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ کائنات بے حد وسیع ہے، اتنی زیادہ وسیع کہ انتہائی طاقتور دور بینوں کی دریافت کے باوجود ابھی تک اس کی وسعتوں کا اندازہ نہ ہوسکا۔ اس ناقابلِ پیائش حد تک وسیع کائنات میں زمین ایک بے حد چھوٹا سیارہ ہے۔ کائنات کے مقابلے میں ہماری زمین اُس سے بھی زیادہ چھوٹی ہے جتنا کہ پوری زمین کے مقابلے میں ایک ذرّہ۔

زمین کا یہ کُرہ وسیع کائنات کے اندر ایک انتہائی نادر استثناء ہے۔ پوری کائنات میں زمین واحد ایسا مقام ہے جہاں استثنائی طور پر پانی، سبزہ، ہوا اور آکسیجن جیسی چیزیں موجود ہیں۔ زمین پر زندگی ہے اور اسی کے ساتھ وہ چیز بھی موجود ہے جس کو لائف سپورٹ سسٹم کہا جاتا ہے۔ زمین کے اندر وہ ساری قیمتی چیزیں رکھ دی گئی ہیں جن کو استعمال کرکے انسان تہذیب وتمدن کی تعمیر کرتا ہے۔ زمین کے اندر تہذیب کے تمام اجزاء امکانی طور پر موجود ہیں۔ انسان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اِس پوٹینشیل (potential) کو ایکچول (actual) بنائے۔

اس اعتبار سے دیکھیے تو تہذیب کی تاریخ مسلسل طور پر ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف جارہی ہے۔ وہ ترقی کے ابتدائی مرحلے سے گذر کر ترقی کے اعلیٰ مرحلے کی طرف اپنا سفر طے کررہی ہے۔ تہذیب کے اس سفر کی تفصیل اقوامِ متحدہ کے زیر اہتمام تیار کردہ کتاب تاریخ البشریّۃ (The History of Mankind) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

تہذیبِ انسانی کے اس سفر کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ قرآن کی سورہ الانشقاق میں بتایا گیا ہے کہ زمین پر رات اور دن کی صورت میں بار بار تبدیلی کا واقعہ ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح زمین پر زیادہ بڑا واقعہ بھی پیش آئے گا۔ چنانچہ فرمایا کہ: تم کو ضرور ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر پہنچنا ہے۔ تو انھیں کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ خدا کی طرف نہیں جھکتے:

You will surely move from one stage to another stage. What then is the matter with them, that they believe not? and when the Qur'an is read to them, they don't surrender before God. (84: 19-21)

قرآن کی ان آیات میں انسان کی اسی تہذیبی تاریخ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ کا ارتقاء معلوم طور پر بتا رہا ہے کہ انسانی تہذیب مسلسل ترقی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس ترقی کا آخری نمونہ وہی ہوگا جس کو روحانی تہذیب یا جنت کہا گیا ہے۔

تہذیب کی تاریخ بتاتی ہے کہ معلوم طور پر، انسانی تہذیب تین بڑے اَدوار سے گزر چکی ہے۔ تمام قرائن بتا رہے ہیں کہ اب وہ اپنے سفر کے چوتھے اور آخری مرحلے میں داخل ہوگئی ہے۔ تہذیب کے یہ تین بڑے ادوار حسب ذیل ہیں:

۱۔ حَجری تہذیب (Stone Civilization)

۲۔ زرعی تہذیب (Agricultural Civilization)

۳۔ صنعتی تہذیب (Industrial Civilization)

ہر شخص جانتا ہے کہ تہذیب کے یہ تین ادوار وقوع میں آچکے ہیں۔ تاہم فیوچر شاک (Future Shock) کے مصنف الوِن ٹافلر (Alvin Taffler) کا کہنا ہے کہ تہذیب کا چوتھا، اور شاید آخری دور مستقبل میں ظاہر ہونے والا ہے۔ اس چوتھے دور کو الون ٹافلر نے سُپر انڈسٹریل ایج (Super Industrial Age) کہا ہے۔ یہ چوتھا دور، پچھلے ادوار کے مقابلے میں، مادّی سے زیادہ غیر مادی ہوگا۔ اس لیے زیادہ بہتر ہے کہ اس چوتھے دور کو روحانی تہذیب (Spiritual Civilization) کا نام دیا جائے۔

۱۔ اب پہلی تہذیب، حجری تہذیب کو لیجئے۔ یہ تہذیب کا وہ دور ہے جب کہ انسان صرف یہ کر سکا تھا کہ زمین کی سطح پر بروقت جو چیزیں موجود ہیں ان کو اسی خام صورت میں استعمال کرے۔ ان موجودہ چیزوں میں پتھر سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ اس لیے علامتی طور پر اس دور کو حجری دور کہا گیا۔ اگر چہ ابتدائی تہذیب کے اس دور میں پتھر کے علاوہ دوسری بہت سی چیزیں استعمال میں آئیں جو پہلے سے زمین کی سطح پر دستیاب تھیں۔ مثلاً لکڑی، حیوانات، باقاعدہ زراعت کے بغیر ملنے والی پیداوار، وغیرہ۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے، حجری تہذیب کے زمانے میں بھی انسان وہی تمام فطری اوصاف رکھتا تھا جو وہ آج رکھتا ہے۔ مثلاً بعد کی تحقیقات نے بتایا ہے کہ انسان کے برین میں ایک سوملین بلین بلین پارٹیکل موجود ہیں۔ حجری دور کے انسان کے دماغ میں بھی اتنے ہی پارٹکل موجود تھے۔ مگر تعلیم و تربیت کی کمی کی بنا پر انسان ابھی اس قابل نہیں بنا تھا کہ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے ان فطری امکانات کو استعمال کر سکے۔

۲۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے وہ زمانہ آیا جس کو زرعی دور کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ دور جس کو ہم نے زرعی تہذیب (Agricultural Civilization) کا نام دیا ہے۔ اس دور میں انسان نے مزید آگے بڑھ کر نیچر میں تصرف کا طریقہ دریافت کیا۔ اس دور میں آب پاشی، زراعت، مویشی کی پرورش، لوہے کا استعمال، پہیے دار گاڑی اور اس قسم کی دوسری چیزیں دریافت کیں۔ اس طرح یہ ممکن ہوا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ بہتر زندگی گزار سکے۔

۳۔ اس کے بعد تیسرا دور وہ ہے جس کو صنعتی دور یا صنعتی تہذیب کہا جاتا ہے۔ یہ تیسرا دور اُس وقت شروع ہوا جب کہ انسان نے حیوانی طاقت سے آگے بڑھ کر میکانیکل پاور کو دریافت کیا۔ اب انسان نے پانی کو اسٹیم پاور میں تبدیل کیا اور اسٹیم انجن بنائے۔ اسی طرح انسان نے پٹرول کو دریافت کیا اور پٹرول سے چلنے والی مشینیں بنائیں۔ اسی طرح اُس نے کمیونیکیشن کے نئے ذرائع دریافت کیے جس نے پوری دنیا کو ایک گلوبل ولیج بنا دیا۔

صنعتی دور میں انسان نے میکانیکل پاور کو استعمال کر کے بہت سی چیزیں بنائیں۔ مثلاً تیز رفتار سواری، تیز رفتار خبر رسانی، کاغذ اور چھپائی کے طریقے، نئے اصولوں پر شہری تعمیر، تعلیم و ترقی کا نیا نقطۂ نظر، وغیرہ۔ اس طرح حسن اور معنویت کی ایک نئی دنیا وجود میں آئی جس کو صنعتی تہذیب کہا جاتا ہے۔

تہذیب کا چوتھا دور وہ ہے جس کو الون ٹافلر نے سُپر انڈسٹریل ایج کا نام دیا ہے۔ الون ٹافلر کے بیان کے مطابق، سُپر انڈسٹریل ایج کی خاص صفت یہ ہوگی کہ وہاں مکمل طور پر آٹومیشن (automation) کا رواج ہوگا۔ یعنی الیکٹرانکس کا استعمال اتنا زیادہ بڑھ جائے گا کہ بیش تر کام خود بخود

ہونے لگیں گے۔ عام حالات میں انسان کا چاہنا ہی اِس مقصد کے لیے کافی ہوجائے گا کہ اس کی تمام ضرورتیں خود بخود معیاری طور پر پوری ہوتی رہیں۔

آٹومیشن کا یہ نظام عین وہی چیز ہے جس کی پیشگی اطلاع جنت کے بارے میں دی گئی ہے۔ قرآن میں جنت کے بارے میں بتایا گیا ہے: **ولکم فیہا ماتشتھی انفسکم ولکم فیہا ما تدعون** (حٰم السجدہ ۳۱) یعنی تمہارے لیے جنت میں ہر وہ چیز ہے جس کو تمہارا دل چاہے اور تمہارے لیے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم طلب کروگے۔

الون ٹافلر نے مستقبل کے اس دور کو سُپر انڈسٹریل ایج کہا ہے۔ وہ گویا جنتی کلچر کا دوسرا نام ہے۔ یہ گویا جنت کی پیشگی خبر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ سُپر انڈسٹریل ایج مستقبل کے اُس معیاری دور کو علمی اعتبار سے قابلِ فہم بنادیتا ہے جس کو اوپر کی تقسیم میں اسپریچول سویلائزیشن کا نام دیا گیا ہے۔

بظاہر تہذیب کا یہ چوتھا دور زیرِتعمیر ہے۔ یہی چوتھا دور وہ دور ہے جس میں غالباً اُس معیاری دنیا کا ظہور ہوگا جس کو مذہبی اصطلاح میں جنت (paradise) کہا گیا ہے۔ موجودہ تحویلی دَور (Transitional Period) گویا وہ حالت ہے جس کو زیرِتعمیر جنت (Paradise in the making) کہا جاسکتا ہے۔

جنت گویا تہذیبی سفر کے آخری دور کا نام ہے۔ خدائی اہتمام کے تحت بننے والی یہ دنیا یقیناً اپنے وقت پر بنے گی۔ یہ دنیا ایک معیاری دنیا ہوگی۔ اس دنیا میں ہر قسم کی محدودیت (limitation) اور ڈس ایڈوانٹیج (disadvantage) کا خاتمہ ہوجائے گا۔ یہاں نہ خوف ہوگا اور نہ حُزن۔ یہاں نہ شور ہوگا اور نہ تکلیف۔ جنت کی یہ دنیا انسان کے اُن خوابوں کی تعبیر ہوگی جن کو وہ پہلے دن سے دیکھتا رہا ہے۔

اِسی کے ساتھ انسان کی ہستی میں نئی ترقیاں ظہور میں آئیں گی۔ یہ انسان کا نقطۂ عروج ہوگا، جہاں پہنچ کر انسان ایک کامل انسان بن جائے گا۔ اس کو وہ ابدی زندگی مل جائے گی جو بڑھاپا، حادثہ، بیماری اور موت سے خالی ہوگی۔ یہ وہ معیاری دنیا ہوگی جہاں انسان اس پوزیشن میں ہوگا کہ وہ اپنی

ہستی کے تمام امکانات کو استعمال کرے۔ وہ کامل فُل فِل منٹ کا اعلیٰ تجربہ کرسکے۔

جنت گویا انسانی تہذیب کے ارتقائی عمل کا نقطۂ عروج (culmination) ہے۔ جنت اُس پرفیکٹ اور آئیڈیل دنیا کا ظہور ہے جس کا خواب ہمیشہ سے انسان دیکھتا رہا ہے۔ جنت میں پہنچ کر انسان تمام مصائب اور تمام مصیبتوں سے نجات پا جائے گا۔ جنت راحتوں اور خوشیوں کا وہ معیاری مقام ہوگا جس کے لیے کوئی فنا نہیں۔

مزید یہ کہ جنت کوئی ٹھہراؤ کی جگہ نہ ہوگی (الکہف: ۱۰۸)۔ جنت میں انسان کو ہر وقت نئی نئی دریافتیں ہوں گی، ایسی دریافتیں جن کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جنت میں بورڈم نہیں ہوگا۔ کیوں کہ بورڈم وہاں ہوتا ہے جہاں نئی دریافتیں نہ ہو رہی ہوں۔ انسان کے لیے نئی دریافت خوشی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ جنت میں ہر روز لامحدود حقائق کا کوئی نیا دروازہ کھُلتا رہے گا۔ اسی لیے جنت کی خوشی ایک ابدی خوشی ہوگی، نہ کہ صرف ایک وقتی خوشی۔

اس جنت کا بننا اتنا ہی ممکن ہے جتنا کہ زمین کا بننا اور زمین پر مختلف تہذیبوں کا وجود میں آنا۔ قدیم حجری دَور کے اندر زیادہ ترقی یافتہ زرعی دَور چھپا ہوا تھا جو اپنے وقت پر ظاہر ہوا۔ اسی طرح زرعی دور کے اندر زیادہ ترقی یافتہ صنعتی دَور چھپا ہوا تھا جو اپنے وقت پر ظاہر ہو کر سامنے آیا۔ اسی طرح صنعتی دَور کے اندر زیادہ ترقی یافتہ، لطیف اور روحانی دور چھپا ہوا ہے جو اپنے وقت پر ظاہر ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے گا۔ اس روحانی دَور یا جنتی دور کا ظہور میں آنا عملی طور پر اتنا ہی ممکن ہے جتنا کہ پچھلے اَدوار کا ظہور میں آنا۔

جب جدید صنعتی دور آیا تو زمین کو دوبارہ سجایا گیا۔ منصوبہ بند انداز میں اس کی تعمیر کی گئی۔ تمدنی ترقیوں نے زمین کو ایک نئی، زیادہ بہتر زمین بنا دیا۔ اسی طرح جب تہذیبی ترقی کا آخری دور، روحانی دور آئے گا تو زمین کو مزید زیادہ بہتر اور زیادہ مکمل بنا دیا جائے گا۔ اس حقیقت کی طرف قرآن میں واضح اشارے موجود ہیں۔ مثلاً فرمایا کہ: اُس وقت زمین زیادہ کشادہ کر دی جائے گی (الانشقاق ۳) زمین کے صالح باشندے آزادانہ طور پر اس کے مالک بن جائیں گے (الزمر: ۷۴) حتیٰ کہ پوری کائنات

اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ اہلِ جنت کے چارج میں دے دی جائے گی (الحدید: ۲۱)

اسلامی روایات کے مطابق، زمین اپنی ابتدا میں جنوں کے چارج میں تھی۔ اس کے بعد وہ انسانوں کے چارج میں دی گئی۔ اب وہ آخری دور آنے والا ہے جب کہ زمین مکمل طور پر فرشتوں کے چارج میں دے دی جائے۔ اُس وقت زمین میں ایسی تبدیلیاں لائی جائیں گی کہ وہ پورے معنوں میں ایک آئیڈیل ورلڈ اور پرفیکٹ ورلڈ بن جائے۔ زمین کے اس ارتقائی دور کی بابت قرآن میں اشارات موجود ہیں۔ مثلاً فرمایا کہ: یہ وہ دن ہوگا جب کہ زمین خدا کے نور سے جگمگا اُٹھے گی (الزمر ۶۹) آج زمین امکانی معنوں میں جنت ہے۔ کل یہ امکان واقعہ بن جائے گا۔ اور پھر زمین خوشیوں اور راحتوں کا ابدی مقام بن جائے گی۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ زمین کی موجودہ حالت آئیڈیل حالت نہیں ہے۔ زمین پر نیچر کا قائم کیا ہوا لائف سپورٹ سسٹم بہترین حالت میں موجود ہے۔ زمین پر ہر قسم کے سامانِ حیات بہترین حالت میں موجود ہیں، مگر اسی کے ساتھ زمین پر ایک غیر آئیڈیل حالت پائی جاتی ہے۔ یہاں اچھے لوگوں کے ساتھ بُرے لوگ بھی موجود ہیں۔ برے لوگوں کی یہ موجودگی زمین پر ہر قسم کے فسادات کا سبب ہے۔ جب ارتقائی سفر کا آخری مرحلہ سامنے آئے گا تو زمین کی آبادی سے تمام برے لوگ چھانٹ کر الگ کر دیے جائیں گے۔ اس کے بعد زمین صرف اچھے لوگوں کے چارج میں آجائے گی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''اور ہم نے زبور میں موعظت کے بعد لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے'' (الانبیاء ۱۰۵) یہ بات جو قرآن میں بتائی گئی ہے وہ اب بھی تفصیل کے ساتھ بائبل (زبور) میں موجود ہے۔ اس کا ایک جُزو یہ ہے— پُر شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی۔ صادق زمین کے وارث ہوں گے۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے:

The righteous shall inherit the land, and
dwell in it forever (Psalm 37:29)

خلاصۂ کلام

مطالعہ بتاتا ہے کہ وسیع کائنات میں ہماری زمین ایک نادر استثناء ہے۔ وسیع خلا میں انتہائی بڑے بڑے ستارے اس سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں جتنا کہ تمام سمندروں کے کنارے ریت کے ذرے۔ مگر یہ تمام ستارے صرف آگ کے گولے ہیں۔ معلوم طور پر ۱۳ بلین سال سے اب تک وہ اسی ایک حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس بظاہر ''جامد'' کائنات میں صرف ایک چیز غیر جامد ہے اور وہ ہماری زمین ہے۔ زمین میں استثنائی طور پر ایک ارتقائی عمل (evolutionary process) جاری ہے۔ زمین پر ایک کے بعد ایک مختلف اسٹیج آرہے ہیں— ۱۰ بلین سال پہلے زمین صرف ایک آگ کا گولا (fire ball) تھی۔ اس کے بعد وہ سرد ہو کر ٹھنڈا سیارہ (cool planet) بنی۔ اس کے بعد اس کے اوپر پانی کا دور آیا۔ پھر زمین کی سطح پر سبزہ اور درخت اگے۔ پھر اس میں حیوانات پیدا ہوئے۔ اس کے بعد انسان کا ظہور ہوا۔ انسان کے ظہور کے بعد زمین پر تہذیبی ارتقاء کے ادوار آنے شروع ہوئے۔ انسان نے پہلے کم ترقی یافتہ دنیا (underdeveloped world) بنائی۔ اس کے بعد انسان ترقی یافتہ دنیا (developed world) بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ ارتقائی عمل مسلسل جاری ہے۔ اور یہ کہنا بالکل فطری ہے کہ ابھی زمین پر ایک اور زیادہ بہتر دور آنے والا ہے جس کے بعد یہ زمین ایک معیاری دنیا (perfect world) کی صورت اختیار کرلے گی:

> It is but natural to believe that one more stage
> is in the ofting, that of a perfect world.

جنت کوئی پراسرار چیز نہیں، جنت معلوم ارتقائی پراسس کا آخری اسٹیج ہے۔ جہاں تک حیوانات میں عضویاتی ارتقاء (organic evolution) کی بات ہے وہ تو بلاشبہہ ایک بے بنیاد مفروضہ ہے۔ مگر غیر ذی روح دنیا میں دَوری ارتقاء (periodic evolution) ایک ثابت شدہ واقعہ ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ اس فطری قانون کے مطابق جنت پوری طرح ایک قابل فہم واقعہ ہے۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ تقریباً ۱۰ ملین سال پہلے ہماری زمین آگ کا ایک گولا (fireball) تھی۔ اس کے بعد وہ ایک

سرد سیارہ(cool planet) بنی۔ پھر انسانی آبادی کے بعد یہاں وہ دنیا بنی جس کو زیرِتعمیر دنیا (underdeveloped world) کہا جاتا ہے۔اس کے بعداس میں ایک اور ارتقائی مرحلہ آیا اور صنعتی انقلاب کے بعد وہ دنیا بنی جس کوترقی یافتہ دنیا (developed world) کہاجاتا ہے۔

یہ چار دَور (periods) زمین پرآچکے ہیں۔اب خودارتقائی قانون کے مطابق، زمین ایک اعلیٰ تر مرحلے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ گویا زمین کا آخری ارتقائی مرحلہ ہوگا۔اس اعتبار سے اس کو معیاری دنیا(perfect world) کہا جا سکتا ہے۔اس معیاری دنیا میں ہرقسم کی محدودیتیں(limitation) ختم ہوجائیں گی۔خدائی اہتمام کے تحت یہاں کامل معنوں میں عادلانہ سماج (just order) بنایا جائے گا۔ برے لوگوں کو زمین سے ہٹادیاجائے گااورصرف اچھے لوگوں کو یہاں بسنے کی آزادی ہوگی۔ کثافت (pollution) کی تمام صورتیں ختم ہوجائیں گی۔مصیبتوں(calamities) کا خاتمہ ہوجائے گا۔ بیماری ،حادثہ ، بڑھاپا اور موت جیسے تمام ڈس اڈوانٹیج (disadvantage) ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائیں گے۔

موجودہ دنیا میں ہرکام سخت محنت کے ذریعے انجام پاتا ہے۔موجودہ دنیا میں محنت اور کامیابی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔ جنت میں یہ صورت حال ختم کردی جائے گی۔ جنت میں ایسی نفیس تبدیلیاں واقع ہوں گی،جس میں ہرکام ایک پُرلطف مشغلے کی حیثیت اختیار کرلے گا(یٰس ۵۵)۔جنت میں الگ سے تفریح (entertainment) کی ضرورت نہ ہوگی۔کیوں کہ خود روزمرّہ کا کام ہی تفریح کا ذریعہ بن جائے گا۔

انسان فطرت کے زور پر ہزاروں سال سے جس مطلوب دنیا (desired world) کی ناکام تلاش کررہا تھا وہ دنیا اپنی کامل صورت میں اس کو مل جائے گی۔انسان اس دنیا میں ہمیشہ کے لیے خوشیوں اور راحتوں بھری زندگی کو پالے گا۔ جسمانی محنت (physical labour) کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔صرف خوشگوار ذہنی سرگرمیاں (pleasant intellectual activities) تمام مطلوب نتائج کے حصول کے لیے کافی ہوجائیں گی۔

جنت کی دریافت

غالباً ۱۹۸۳ کی بات ہے۔ اُس وقت دہلی میں ایک انگریز مسٹر جان بَٹ(John Butt) رہتے تھے۔ اُنھوں نے میری انگریزی کتابیں پڑھی تھیں اور میری فکر سے کافی مانوس ہو چکے تھے۔ ملاقات کے دوران ایک بار میں نے اُن سے کہا کہ قلم میری محبوب چیز ہے۔ میں نے بہت سے قلم استعمال کیے مگر مجھے اپنی پسند کا قلم ابھی تک نہیں ملا۔ اُنھوں نے کہا کہ میں جلد ہی لندن جانے والا ہوں، وہاں سے میں آپ کے لیے ایک اچھا قلم لے آؤں گا۔

کچھ عرصے کے بعد وہ مجھ سے ملے اور انگلینڈ کا بنا ہوا ایک قلم مجھے دیتے ہوئے کہا کہ میں نے لندن اور آکسفورڈ کی مارکیٹ میں کافی تلاش کے بعد یہ قلم (فاؤنٹین پین) حاصل کیا ہے۔ تاہم مجھے امید نہیں کہ یہ قلم آپ کی پسند کے مطابق ہوگا۔ میں نے کہا، کیوں۔ اُنھوں نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ ایک پرفیکشنسٹ (perfectionist) ہیں اور دنیا میں چونکہ کوئی بھی قلم پرفیکٹ قلم نہیں، اس لیے آپ کو کوئی بھی قلم پسند نہیں آئے گا۔

اصل یہ ہے کہ ہر آدمی پیدائشی طور پر پرفیکشنسٹ ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان ایک کمال پسند حیوان ہے:

Man is a perfection-seeking animal.

انسانی فطرت کا یہی خاص پہلو ہے جس کی بنا پر ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ محرومی (frustration) کے احساس میں مبتلا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو دنیا کا ہر سامان حاصل کر لیتے ہیں وہ بھی محرومی کے احساس سے خالی نہیں ہوتے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے پرفیکشنسٹ ہے مگر جس دنیا میں وہ رہتا ہے اُس کی کوئی بھی چیز پرفیکٹ نہیں۔ اس طرح انسان کی طلب اور دنیا کی قابلِ حصول چیزوں کے درمیان ایک عدم مطابقت (incompatibility) پیدا ہوگئی ہے۔ دونوں کے درمیان یہی عدم مطابقت

انسان کے اندر محرومی کے احساس کا اصل سبب ہے۔

انسان اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے دنیا میں جدوجہد شروع کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ وہ دولت، اقتدار، ساز وسامان اور دوسری مطلوب چیزیں حاصل کر لیتا ہے۔ مگر اُس کو محسوس ہوتا ہے کہ اپنی مطلوب چیزوں کو پانے کے بعد بھی وہ بدستور محرومی کے احساس سے دوچار ہے، اب بھی وہ یافت کے احساس تک نہ پہنچ سکا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ پانے سے پہلے وہ سمجھتا ہے کہ یہی وہ چیز ہے جس کی آرزو وہ اپنے دل میں لیے ہوئے ہے۔ مگر کسی چیز کو پانے کے بعد اُس کو وہ تسکین نہیں ملتی جو کسی مطلوب چیز کی یافت سے ہونی چاہئے۔ کیوں کہ اُس کے دل میں جو آرزو تھی وہ پرفیکٹ چیز کے لیے تھی۔ جب کہ دنیا کی ہر چیز غیر پرفیکٹ (imperfect) ہے اور ظاہر ہے کہ کسی پرفیکشنسٹ کو غیر پرفیکٹ میں تسکین نہیں مل سکتی۔

اس مسئلے کا حل صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ آدمی جنت کو اپنا نشانہ بنائے۔ جنت پورے معنوں میں ایک پرفیکٹ ورلڈ (perfect world) ہے، جب کہ اُس کے مقابلے میں موجودہ دنیا صرف ایک اِم پرفیکٹ ورلڈ (imperfect world) کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے جس پرفیکٹ ورلڈ کا طالب ہے، وہ جنت ہے۔ جنت کی معرفت نہ ہونے کی وجہ سے آدمی موجودہ دنیا میں اپنی آرزوئیں پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی فطرت اور خارجی دنیا کے درمیان عدم مطابقت کی بنا پر محرومی کے احساس کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ آدمی کے اندر وہ شعوری انقلاب لایا جائے کہ وہ جنت کی معرفت حاصل کر سکے۔ اس معرفت کے حصول کے بعد اُس کی مایوسی کا احساس اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ کیوں کہ وہ جان لے گا کہ جن چیزوں میں وہ اپنی آرزوؤں کی تسکین ڈھونڈھ رہا ہے اُن میں اُس کے لیے تسکین کا سامان موجود ہی نہیں۔ اس دریافت کے بعد اُس کی توجّہ جنت کی طرف لگ جائے گی۔ اس کے بعد وہ موجودہ دنیا کی چیزوں کو ضرورت کے طور پر لے گا، نہ کہ مطلوب کے طور پر۔ اور جب کسی آدمی کے اندر یہ سوچ پیدا ہو جائے تو اُس کے بعد اُس کا حال یہی ہوگا کہ وہ یافت کے احساس میں جینے لگے گا، نہ کہ محرومی کے احساس میں۔

موجودہ دنیا پانے سے زیادہ کھونے کی جگہ ہے۔ یہاں ہر مرد اور عورت کو بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ فلاں چیز اُس سے کھوئی گئی۔ فلاں موقع اُس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ فلاں شخص نے اُس کو نقصان پہنچادیا۔ اس قسم کے چھوٹے یا بڑے حادثات ہر ایک کو بار بار پیش آتے ہیں۔ کسی بھی مرد یا عورت کے لیے ان نقصانات سے بچنا ممکن نہیں۔

اس قسم کے نقصانات ہر ایک کو پیش آتے رہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان نقصانات کی تلافی کی صورت کیا ہے۔ اس کی صورت صرف ایک ہے۔ اور وہ جنت کا یقین ہے۔ جس آدمی کو خدا کی جنت پر یقین ہو اُس کا حال یہ ہوگا کہ ہر نقصان کے بعد وہ یہ کہہ سکے گا کہ دنیا کا یہ نقصان تو بہت چھوٹا ہے۔ جنت کے مقابلے میں اس نقصان کی کوئی حقیقت نہیں۔ دنیا کے ہر نقصان کے بعد وہ اور زیادہ خدا کی طرف متوجہ ہوجائے گا۔ وہ خدا سے اور زیادہ جنت کا طالب بن جائے گا۔

قرآن میں جنت کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ وہاں آباد ہونے والے لوگوں کے لیے نہ خوف ہوگا اور نہ حُزن (البقرہ ۳۸)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں انسان کو جو زندگی ملتی ہے وہ کبھی اور کسی کے لیے خوف اور حُزن سے خالی نہیں ہوتی۔ موجودہ دنیا کا نظام اس ڈھنگ پر بنا ہے کہ یہاں حقیقی معنوں میں خوف اور حزن سے خالی زندگی کا حصول ممکن ہی نہیں۔ ایسی حالت میں آدمی کے لیے واحد درست رویّہ یہ ہے کہ وہ دنیا کو اپنا مقصود نہ بنائے۔ وہ دنیا کو صرف یہ حیثیت دے کہ وہ حقیقی منزل کی طرف جانے کا ایک راستہ ہے۔

اسی حقیقت کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: **اللھم لا عیش الا عیش الآخرۃ**۔ یعنی راحت اور مسرّت کا حصول صرف آخرت میں ممکن ہے۔ دنیا میں راحت و مسرّت تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مسافر ریلوے اسٹیشن پر اپنے لیے ایک آرام دہ گھر بنانے کی کوشش کرے۔ ہر مسافر جانتا ہے کہ اسٹیشن گھر بنانے کے لیے نہیں ہوتا۔ اسی طرح موجودہ دنیا عمل جنت کے لیے ہے، نہ کہ تعمیر جنت کے لیے۔ جنت کو اپنی منزل مقصود بنانا صرف عقیدے کی بات نہیں وہ مقصد حیات کی بات ہے، ایسا مقصد جس کے سوا کوئی اور مقصد انسان کے لیے ممکن نہیں۔

جنت کا استحقاق

جنت بے حد عظیم نعمت ہے۔ وہ بے حد مہنگی قیمت پر کسی کو ملے گی۔ بہت تھوڑے خوش نصیب لوگ ہوں گے جو جنت کی لطیف دنیا میں بسائے جانے کے قابل ٹھہریں۔

جنت میں داخلے کا پہلا امتحان یہ ہے کہ آدمی معرفت کے درجے میں اپنے رب کو پائے۔ افکار و خیالات کے جنگل میں وہ سچائی کو دریافت کرے۔ وہ نہ دکھائی دینے والے واقعے کو دیکھے۔ وہ نہ محسوس ہونے والی چیز کو محسوس کرے۔ وہ ظاہری ہنگاموں سے گزر کر باطن کی دنیا کا مسافر بن جائے۔

اسی طرح جنت میں داخلے کی شرط یہ ہے کہ آدمی سرکشی کا اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو خدا کے آگے جھکا دے۔ خود پرست بننے کے تمام محرکات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ سچا خدا پرست بن جائے۔ کشش اور جاذبیت کے بے شمار مراکز سے منہ موڑ کر وہ ہمہ تن خدا کی طرف متوجہ ہو جائے۔

اسی طرح جنت میں داخلہ صرف اس شخص کے لیے ممکن ہوگا جو منفی حالات کے درمیان ہمیشہ مثبت ذہن پر قائم رہے۔ جو اپنے سینے میں اٹھنے والے حسد اور گھمنڈ اور انتقام جیسے جذبات کو دفن کر کے یک طرفہ طور پر لوگوں کے لئے شفقت اور خیر خواہی کا پیکر بن جائے۔ جو ظلم اور بے انصافی کے مواقع کو پانے کے باوجود انہیں استعمال نہ کرے اور ہر حال میں اپنے آپ کو عدل و انصاف کا پابند بنا لے۔

جنت ایک نفیس ترین خدائی کالونی ہے۔ اس نفیس کالونی میں صرف وہی روحیں داخل ہوں گی جو آخرت میں اس طرح پہنچیں کہ دنیا میں انھوں نے اپنے اوپر تطہیر کا عمل کر لیا تھا۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کثیف شخصیت کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے۔ اب ہر آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی ذات پر خود تطہیری کا ایک مسلسل عمل شروع کرے۔ یہاں تک کہ اس کی کثیف شخصیت پاک و صاف ہو کر لطیف شخصیت میں بدل جائے۔

جنتی انسان وہ انسان ہے جو کانٹوں کے درمیان پھول بن کر رہے۔ جو اندھیروں کے درمیان

روشنی کا مینار بن سکے۔ جو زلزلوں اور طوفانوں کے درمیان سکون کا راز پالے۔ جو نفرتوں کے درمیان محبت کا ثبوت دے۔ جو لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود یک طرفہ طور پر انھیں معاف کر دے۔ جو کھونے میں بھی پانے کا تجربہ کرے۔

جنتی انسان وہ ہے جو بظاہر خدا سے دور ہوتے ہوئے بھی خدا سے قریب ہو گیا ہو۔ جو سورج کی شعاعوں میں خدا کے نور کو دیکھے۔ جو ہواؤں کے جھونکے میں لمسِ ربانی کا تجربہ کرے۔ جو پہاڑوں کی بلندی میں خدا کی عظمت کا تعارف حاصل کر سکے۔ جو دریاؤں کی روانی میں خدا کی رحمت کا مشاہدہ کرے۔ جو مخلوقات کے آئینے میں خالق کا جلوہ دیکھنے لگے۔

خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے یہ بتا دیا ہے کہ جنتی انسان کی صفات کیا ہوتی ہیں۔ جو لوگ دنیا کی زندگی میں اپنے اندر جنتی صفات پیدا کریں، وہ موت کے بعد جنت میں داخلے کے مستحق قرار پائیں گے۔

جنت میں داخلہ نہ کسی سفارش کی بنیاد پر ہوگا، نہ کسی کے ساتھ نسبت کی بنیاد پر اور نہ کسی پر اسرار عملیات کی بنیاد پر۔ جنت میں داخلہ پوری طرح معلوم حقیقت پر مبنی ہے۔ اور وہ یہ کہ جو آدمی موجودہ دنیا میں اپنے قول و عمل کے اعتبار سے جنتی انسان بن کر رہے گا، وہ آخرت کی جنت میں داخلہ پائے گا۔

قرآن کے مطابق، جنت اہل تزکیہ کے لئے ہے۔ تزکیہ یہ ہے کہ آدمی غفلت کی زندگی کو ترک کرے اور شعور کی زندگی کو اپنائے۔ وہ اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچائے جو حق سے روکنے والی ہیں۔ مصلحت کی رکاوٹ سامنے آئے تو اس کو نظر انداز کر دے۔ نفس کی خواہش ابھرے تو وہ اس کو کچل دے۔ ظلم اور گھمنڈ کی نفسیات جاگے تو وہ اس کو اپنے اندر دفن کر دے۔

محاسبہ (accountability)

کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانے کی سب سے بڑی انڈسٹری لوپ ہول انڈسٹری ہے۔ یعنی قوانینِ ملکی میں رَخنہ تلاش کرکے اُس سے بچنے کی صورت نکالنا:

A means of evading a rule.

کوئی قانون، خواہ وہ کتنا ہی مکمل ہو، وہ بہر حال انسانی زبان میں ہوتا ہے، اور انسانی زبان ایک محدود ذریعۂ اظہار ہے، وہ لامحدود طور پر تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی زبان میں بنائے ہوئے ہر قانون میں loophole موجود ہوتے ہیں۔ انسانی دماغ اس لوپ ہول کو دریافت کرکے اپنے لیے قانون سے فرار کی گنجائش نکال لیتا ہے۔

مثلاً ایک تاجر ٹیکس کے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ اپنی کمائی سے مطلوب ٹیکس ادا نہیں کرتا۔ اب انکم ٹیکس کا محکمہ ٹیکس کی قانونی دفعات کا حوالہ دے کر اس پر فردِ جرم عائد کرتا ہے۔ اِس کے بعد تاجر یہ کرتا ہے کہ وہ ایک قانونی ماہر کو بہت بڑی رقم دے کر حاصل کرتا ہے۔ یہ قانونی ماہر قانونی دفعات کا گہرا مطالعہ کرکے ایسے قانونی نکتے دریافت کرتا ہے، جس کی روشنی میں ٹیکس کا وہ قانون مذکورہ تاجر پر منطبق نہ ہوسکے۔ وہ عملاً باطل ہوکر رہ جائے۔

یہ معاملہ صرف ایک تاجر اور ایک وکیل کا نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہر انسان کا ہے۔ موجودہ دنیا میں جو بھی معاملہ پیش آتا ہے وہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اِس دنیا میں ہر معاملہ دو برابر کے فریقوں کے درمیان ہوتا ہے، اس لیے دونوں طرف یہ نفسیات ہوتی ہے کہ جیسا میں ہوں ویسا ہی وہ بھی ہے۔ ہر فریق کو یہ احساس رہتا ہے کہ اگر میں ہوشیاری کرکے اپنے لیے بچنے کا راستہ نکال لوں تو اس کے بعد دوسرا فریق میرے خلاف کچھ نہیں کرسکتا۔ یہ صورت حال انسانی زندگی سے خوف کا عُنصر نکال دیتی ہے، حالاں کہ خوف کے بغیر انسانی زندگی میں ڈسپلن قائم کرنا ممکن نہیں۔

اس معالے کا حل صرف خدا کے عقیدے میں ہے۔ خدا کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک ایسی ہستی ہے۔ جو تمام انسانوں سے بڑی ہے۔ جس کو ہر عورت اور مرد کے اوپر اعلیٰ اختیار حاصل ہے۔ جو خدا ہر ایک کو پکڑ سکتا ہے جو ہر ایک کو اس کے جرم کی سزا دے سکتا ہے۔ جس کی گرفت سے کوئی بھی شخص باہر نہیں۔ اس طرح خدا کا عقیدہ انسانی زندگی میں خوف کے عنصر کو حتمی طور پر شامل کر دیتا ہے۔ جس کا شامل ہونا انتہائی طور پر ضروری ہے۔

مزید یہ کہ خدا کا عقیدہ بتاتا ہے کہ خدا کو ہر بات کا علم ہے۔ وہ کھلے اور چھپے دونوں سے یکساں طور پر باخبر ہے۔ حتیٰ کہ وہ دل کی حالت کو بھی جانتا ہے۔ اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ انسان اپنے دماغ میں کیا سوچ رہا ہے۔ انسان خواہ اندھیرے میں ہو یا اُجالے میں، وہ تنہا ہو یا پبلک میں، ہر حالت میں وہ خدا کی نظر میں ہے۔ کسی بھی حال میں وہ خدا کی پہنچ سے باہر نہیں۔

خدا کے اِس عقیدے سے وہ چیز پیدا ہوتی ہے جس کو محاسبہ (accountability) کہا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ، ہر عورت اور مرد کے ذہن میں یہ بات بٹھا دیتا ہے کہ اس کی آزادی مطلق آزادی نہیں، وہ خدا کے حکم کے تحت ہے۔ آخر کار خدا ہر ایک سے اس کے قول وعمل کا حساب لینے والا ہے۔ عورت اور مرد دونوں ہر حال میں خدا کی مسلسل نگرانی کے تحت ہیں۔ کسی بھی حال میں وہ خدا کی نگرانی سے باہر نہیں۔

یہی وہ عقیدہ ہے جو کسی انسان کو صالح انسان بناتا ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جس کے ذریعے انسانوں کا وہ مجموعہ ظہور میں آتا ہے، جس کو صالح سماج کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس فرد میں یا جس سماج میں محاسبے کا تصوّر نہ ہو وہ فرد یا سماج اَنارکی کا سماج بن جائے گا۔ ایسے سماج میں صالح اَفراد کی پرورش نہیں ہوسکتی۔

خدا کا تصور انسانی زندگی کی صحیح تشکیل کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ انسان کے اندر بار بار ایسی تحریصات (temptations) آتی رہتی ہیں، جو انسان کو ناانصافی اور ظلم پر اُبھارتی ہیں۔ ایسے موقع پر خود انسان کے اندر یا سماج کے اندر ایسا کوئی محرک موجود نہیں جو اس کے اوپر چیک لگائے۔ جو

اس کو ڈسپلن کے اندر رکھے۔ یہ صرف خدائے برتر کا عقیدہ ہے جو ایسے موقع پر انسان کو کنٹرول میں رکھ سکتا ہے۔

خدا کا اس طرح ضروری ہونا خدا کی موجودگی کا ایک قطعی ثبوت ہے۔ یہ واقعہ کہ انسانی زندگی کی درستگی خدائے برتر کے عقیدے کے بغیر نہیں ہو سکتی، یہی واقعہ اِس بات کو ثابت کر رہا ہے کہ ایک برتر خدا موجود ہے، اور ہر عورت اور مرد اس کے سامنے جواب دہ (responsible) ہیں۔

خدا کا عقیدہ انسان کو یقین عطا کرتا ہے۔ وہ انسان کی زندگی کو منظّم کرتا ہے۔ خدا کا عقیدہ آدمی کو یہ اعتماد عطا کرتا ہے کہ اگر میں نے ایسا کیا کہ اپنی روزمرّہ کی زندگی میں برائیوں سے بچا اور اپنی زندگی میں اعلیٰ انسانی اصولوں کی پیروی کی تو مجھے بیک وقت دو فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک، یہ کہ میں خدا کی پکڑ سے بچ جاؤں گا، اور دوسرے، یہ کہ مجھے خدا کی طرف سے اپنے حُسنِ عمل کا ابدی انعام دیا جائے گا۔

محاسبہ (accountablility) کا عقیدہ انسانی ترقی کا عقیدہ ہے۔ وہ انسانیت کی تکمیل کے لیے طاقت ور محرک کا کام کرتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو سچائی کے راستے پر اِس طرح گامزن کر دیتا ہے جو سفر کی تکمیل سے پہلے رُکنے والا نہیں۔

فطرت کا نظام

فطرت کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں کچھ چیزوں کے لیے براہِ راست انسانی کوشش کی ضرورت ہوتی ہے، اور کچھ چیزیں بالواسطہ نتیجے کے طور پر اپنے آپ آدمی کو حاصل ہوجاتی ہیں۔ زندگی میں کسی حقیقی کامیابی کے لیے فطرت کے اِس نظام کو جاننا اور اس کی پیروی کرنا لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس حقیقت کو جانے بغیر یہاں جو کوشش بھی کی جائے گی وہ یقینی طور رائگاں ہو کر رہ جائے گی۔

مثال کے طور پر پہاڑ کے اوپر بَرف کو پگھلنے کے لیے سورج کی حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن جب برف پگھل جائے تو آگے بڑھنے کے لیے اس کو دھکیلنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ زمین کی ڈھلوان کے ساتھ، پگھلا ہوا پانی اپنے آپ بہہ کر آگے کی طرف رواں ہوجاتا ہے۔ اِسی طرح درخت کا بیج بونے کے لیے انسانی ہاتھ درکار ہوتا ہے۔ لیکن جب درخت نشونما پا جائے تو بعد کو اپنے آپ اس میں پھول اور پھل آنے لگتے ہیں۔ درخت میں پھول اور پھل لانے کے لیے الگ سے کسی مستقل جدوجہد کی ضرورت نہیں ہوتی۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا ہے۔ انسانی زندگی میں بھی فطرت کا یہی نظام اپنا عمل کرتا ہے۔ یہاں بھی یہی معاملہ ہے کہ اصل نشانہ صرف ایک ہے جس کو انسان اپنی جدوجہد کا ہدف بنائے۔ اس کے بعد جو بقیہ چیزیں ہیں وہ اپنے آپ ظہور میں آتی چلی جاتی ہیں۔ دوسری چیزوں کے لیے سادہ فارمولا صرف ایک ہے — انتظار کرو اور دیکھو: wait and see

انسان کو اپنی زندگی میں دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے — مادّی اور روحانی۔ فطرت کے قانون کے مطابق، زندگی کا اصل نشانہ وہ ہے جس کو روحانی نشانہ (spiritual goal) کہا جاسکتا ہے۔ روحانی نشانے کا تعلق انسانی شخصیت سے ہے۔ انسان کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اندر اعلیٰ روحانی شخصیت کی تعمیر کرے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو ذہنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کہا جاسکتا ہے۔ یہی کسی عورت یا مرد کی ترقی کا اصل معیار ہے۔

انسان کو بھوک لگتی ہے تو وہ کھانے کی تلاش کرتا ہے، اس کو پیاس لگتی ہے تو وہ پانی کی تلاش کرتا ہے۔ اس کو سایے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ مکان بنانے کا انتظام کرتا ہے، وغیرہ۔ یہ طریقہ قدیم زمانے سے رائج رہا ہے۔ یہ گویا مادّی ضرورتوں کو فطرت کے دائرے میں حاصل کرنا ہے۔

موجودہ زمانے میں یہ ہوا کہ زندگی کے مسائل کو لے کر نظریات بنائے گیے۔ مثلاً سوشل ازم اور کمیونزم وغیرہ۔ اِن نظریات کے عنوان پر طوفان خیز تحریکیں چلائی گئیں، مگر اُن کا اُلٹا نتیجہ برآمد ہوا۔ یہ تجربہ بتاتا ہے کہ مادّی ضرورتیں اگر فطرت کے دائرے میں حاصل کی جائیں تو اس سے کوئی نیا مسئلہ نہیں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اگر اِن ضرورتوں کی بنیاد پر نظریہ سازی کی جائے اور نظریاتی ہنگامہ آرائی کی جائے تو اس کا نتیجہ ہمیشہ غیر مطلوب صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے زندگی کے معاملے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ انسانی شخصیت کے ذہنی اور روحانی ارتقاء کو اصل اہمیت دے کر اس کے لیے براہِ راست جدوجہد کی جائے، اور مادّی ضرورتوں کے معاملے میں فطرت کے قائم شدہ نظام پر قناعت کی جائے۔

اس طرح ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی جو مادّی ضرورتیں ہیں وہ فطری نظام کے تحت، معتدل طور پر حاصل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ روحانی نشانے کی تکمیل کے لیے تو مکمل طور پر انسان کی جدوجہد درکار ہوتی ہے۔ مگر جہاں تک مادّی چیزوں کا سوال ہے، وہ فطرت کے قوانین کے تحت، تقریباً اپنے آپ حاصل ہوتی چلی جاتی ہیں۔

اس معاملے میں تاریخ کا تجربہ ایک عبرتناک منظر پیش کرتا ہے۔ مثلاً قدیم بادشاہی دَور میں کچھ مصلحین (reformers) نے یہ سمجھا کہ انسانیت دو طبقوں میں بٹ گئی ہے— حاکم اور محکوم۔ انھوں نے اِس سیاسی عدم مساوات کو ختم کرکے سیاسی مساوات لانے کے لیے زبردست جدوجہد شروع کردی۔ ماضی میں لمبی مدت ایسی گذری ہے جب کہ تمام بڑے بڑے اہلِ دماغ نے اسی ایک کام میں اپنے آپ کو کھپا دیا۔ آخر کار بادشاہت پَر مبنی قدیم سیاسی ڈھانچہ ٹوٹ گیا، اور جمہور کی حاکمیت پر مبنی نیا سیاسی ڈھانچہ قائم ہوگیا۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دیکھیے تو قدیم اور جدید میں کوئی بنیادی فرق واقع

نہیں ہوا۔ حاکم اور محکوم کی تفریق بدستور نیے ناموں کے ساتھ باقی رہی۔

کچھ اور مصلحین نے دیکھا کہ لوگوں کے درمیان معاشی وسائل کے اعتبار سے فرق ہے۔ انھوں نے کہا کہ دنیا غیرمحروم اور محروم (haves and have nots) کے درمیان بٹ گئی ہے۔ ہمیں اِس فرق کو مٹانا ہے۔ مگر یہ تفریق سراسر خیالی تھی۔ یہ حال پر مستقبل کو قیاس کرنا تھا۔ تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ سماج میں غیرمحروم اور محروم کی تفریق کوئی مستقل تفریق نہیں۔ اِس مساوات (equation) میں بار بار تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ آج محروم ہیں وہ کل غیرمحروم بن جاتے ہیں۔ اِس اعتبار سے صحیح تفریق غیرمحروم اور محروم کی نہیں ہے بلکہ غیرمحروم اور بالقوہ غیرمحروم (haves and potential haves) کی ہے۔ اِس حقیقت کو سمجھ لیا جائے تو غیرمحروم اور محروم کی لڑائی سرے سے غیرضروری دکھائی دے گی۔

اِسی طرح کچھ مصلحین نے دیکھا کہ سماج کے کچھ طبقات کو ان کا حق (right) مِلا ہوا نہیں ہے۔ انھوں نے ان کے حق کے حصول کے لیے دھواں دھار تحریک شروع کر دی۔ یہاں تک کہ پورا سماج حق شناش (right concious) بن کر رہ گیا۔ اِس طریقے نے سماج کے اندر زیادہ بڑا مسئلہ پیدا کر دیا۔ فطرت کے نظام کے مطابق، زیادہ صحیح طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ فرض شناس (duty concious) بنایا جائے۔ حق شناس سوسائٹی ایک مسئلہ ہے، اور فرض شناس سوسائٹی مسئلے کا حل۔ فطرت کا نظام یہ ہے کہ لوگ جب فرض شناس بن جائیں تو ان کے حقوق اپنے آپ اُنھیں مل جاتے ہیں، جب کہ حقوق طلبی کا طریقہ صرف مسئلے میں اضافہ کرتا ہے، وہ کسی بھی درجے میں مسئلے کو حل نہیں کرتا۔

اسی طرح کچھ مصلحین نے دیکھا کہ سماج میں ایک طبقہ مزدور بنا ہوا ہے، اور دوسرا طبقہ سرمایے دار کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ ایک اقتصادی خرابی ہے اور وہ نجی ملکیت (private property) کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ انھوں نے نجی ملکیت کو ایک برائی (evil) قرار دے کر اس کے خلاف ہنگامہ خیز تحریک شروع کر دی۔ یہاں تک کہ طاقت کے زور پر نجی ملکیتوں کو

چھین لیا۔ اوران کو اسٹیٹ کی ملکیت قرار دے دیا، جو اُن کے نزدیک سماج کی نمائندہ تھی۔ مگر عملی اعتبار سے تباہی اور بَربادی کے سوا اس کا کوئی اور نتیجہ نہیں نکلا۔ حقیقت یہ ہے کہ نجی ملکیت اور اجتماعی ملکیت دونوں اضافی الفاظ ہیں۔ فطرت کا نظام اپنے آپ ان کی تصحیح کرتا رہتا ہے۔ اِس معاملے میں کسی انسانی مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں۔

فطرت کے اٹل نظام کے مطابق، درست بات یہ ہے کہ مادّی معاملات میں لوگ اسٹیٹس کوئسٹ (status quoist) ہوں اور روحانی اور ذہنی ترقی کے معاملے میں وہ ایکٹوسٹ (activist) بنیں۔ یہی صحیح فطری تقسیم ہے۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کے مادّی معاملات ایک خودکار نظام کے تحت برابر چلتے رہتے ہیں، تقریباً اُسی طرح جس طرح پانی فطرت کے مقرر نظام کے تحت بہتا رہتا ہے، اور درخت فطرت کے مقرر نظام کے تحت اُگتے اور بڑھتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اصلاحِ سماج کے نام سے اٹھنے والی طوفانی تحریکیں عملاً سماج کے نظام میں ایک غیر ضروری مداخلت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ذہنی یا روحانی ترقی کیا ہے۔ اس کو دوسرے الفاظ میں شخصیت کی تعمیر (personality development) کہا جاسکتا ہے۔ انسان بیک وقت ایک دہرا وجود ہے— جسم اور روح۔ جسم کی صحت کے لیے مادّی غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح روح کی صحت اور ترقی کے لیے ذہنی اور روحانی غذا درکار ہے۔ فطرت کا نظام اِس طرح بنا ہے کہ جسم کے لیے ضروری غذا برابر مختلف طریقوں سے فراہم ہوتی رہے۔ لیکن جہاں تک روحانی غذا کی بات ہے، اس کے لیے ایک با شعور عمل درکار ہے۔ منظّم قسم کی بالا رادہ کوشش کے بغیر انسانی شخصیت کی مطلوب تعمیر نہیں ہوسکتی۔

شخصیت کی صحت مند اور مطلوب تعمیر کے لیے کچھ ضروری شرطیں ہیں۔ ان شرطوں میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آدمی اپنی مادّی ضرورت اور روحانی ضرورت کے درمیان فرق کرے۔ وہ اِس حقیقت کو جانے کہ روحانی ترقی کا مسئلہ اس کے لیے اوّلین کنسرن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور جہاں تک جسمانی ضرورتوں کی فراہمی کی بات ہے وہ انسانی زندگی میں سکنڈری حیثیت کی چیز ہے۔ آدمی اگر اِس فرق کو بخوبی طور پر سمجھ لے تو بقیہ باتوں کو وہ اپنے آپ ہی جان لے گا۔ زندگی کے سفر میں جب بھی

کوئی موڑ آئے گا تو وہ سمجھ لے گا کہ یہاں اس کی ترجیح کیا ہونی چاہیے، اوراس کو اپنے عمل کا صحیح رُخ کس طرح متعین کرنا چاہیے کہ شخصیت کی تعمیر کا مقصودِ اصلی برابر حاصل ہوتا رہے۔ تعمیرِ ذات کے اِس عمل میں کبھی کوئی رَخنہ پیش نہ آئے۔

اس سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ فطرت کے قانون کے مطابق، ایک چیز کو زیادہ پانے کے لیے دوسری چیز کی کمی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ دنیا جس نظام کے تحت قائم ہے اس میں ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ یہاں دومختلف چیزوں کا حصول بیک وقت یکساں مقدار میں ممکن نہیں۔ یہاں بہرحال یہ ہوگا کہ جب بھی کوئی شخص اپنی شخصیت کے ذہنی اور روحانی ارتقاء کو اولین اہمیت دے گا تو جسمانی تقاضوں کی فراہمی میں ضرور کمی واقع ہوگی۔ اِس دنیا کے قانون کے مطابق، یہاں ایک چیز میں کمی کی قیمت ہی پر دوسری چیز کا مطلوب حد تک زیادہ حصول ممکن ہے۔

اِسی طرح اس معاملے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ مادّی اعتبار سے فراوانی(affluence) ذہنی اور روحانی ارتقاء کے لیے ایک رُکاوٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک عام تجربہ ہے کہ جولوگ مادّی اعتبار سے آسودگی اور خوش حالی میں جیتے ہیں، وہ ہمیشہ ذہنی بونا پن(intellectual dwarfism) کا شکار ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو آپ اپنے قریبی ماحول میں کسی بھی وقت جان سکتے ہیں، اوراس کا تجربہ کرسکتے ہیں۔

تجربے کے طور پر دوانسانوں کا انتخاب کیجیے۔ ایک، وہ انسان جس کو مادّی فراوانی کا ماحول ملا ہوا ہو، اور جو آسودگی کی زندگی گذار رہا ہو۔ ایسے آدمی سے آپ بات کریں تو آپ پائیں گے کہ وہ نہایت سطحی باتیں کرتا ہے، گہری حقیقتوں کا اس کو کوئی علم نہیں۔ اس کو تفریحی کلچر کے بارے میں کافی واقفیت ہوگی لیکن زندگی کے معنوی پہلوؤں سے وہ بالکل بےخبر ہوگا۔ اس سے مل کر یا اس سے بات کرکے آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے کہ وہ ایک خوش پوش حیوان ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی انسان۔

اس کے برعکس، آپ ایک ایسے انسان سے ملیں جس کو خوش حال زندگی حاصل نہ ہو، جو مادّی اعتبار سے مسائل کے درمیان زندگی گذار رہا ہو۔ ایسے انسان سے اگر آپ بات کریں تو

آپ اس کے اندر سنجیدگی پائیں گے۔ اس کو گہری حقیقتوں کی معرفت حاصل ہوگی۔ وہ کسی موضوع پر زیادہ بامعنٰی انداز میں گفتگو کرنے کے قابل ہوگا۔ وہ ذہنی اعتبار سے اِس قابل ہوگا کہ چیزوں کے بارے میں مفکرانہ رائے قائم کر سکے۔ اس کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر آپ محسوس کریں گے کہ آپ نے اُس سے حکمت (wisdom) کا سبق لیا ہے۔ آپ نے اس سے کچھ ایسی باتیں سیکھی ہیں جو اس سے پہلے آپ کو معلوم نہ تھیں۔ ایسے کسی آدمی سے ملاقات آپ کے لیے نیے تجربات کے حصول کا ذریعہ بن جائے گی۔

عورت اور مرد کا فرق

گلاب کا پھول قدرت کا ایک حسین تحفہ ہے۔ مگر اسی کے ساتھ گلاب کے دخت میں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ اگر کچھ لوگ یہ کہیں کہ پھول کے ساتھ کانٹا ایک غیر مطلوب چیز ہے، اس لیے ہمیں چاہیے کہ کانٹے کو گلاب کے درخت سے ختم کر دیں۔ اِس مقصد کو لے کر وہ گلاب کے درخت کے کانٹوں کو ختم کرنا شروع کر دیں تو ہزاروں سال کی کوشش کے باوجود وہ ایسا درخت پیدا کرنے میں ناکام رہیں گے جس میں صرف پھول ہو اور اس میں کانٹے کا خاتمہ ہو گیا ہو۔

بغیر کانٹے والا گلاب کا درخت پیدا کرنے کی کوش تو کسی نے نہیں کی۔ البتہ اسی قسم کی ایک اور کوشش کم ازکم پانچ ہزار سال سے جاری ہے۔ وہ ہے انسانوں کے درمیان سے نابرابری (inequality) کو ختم کرنا۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، اِس قسم کی کوشش مکمل طور پر ناکام ثابت ہوئی ہے۔

ہسٹری آف تھاٹ بتاتی ہے کہ پچھلے پانچ ہزار سال کے دَوران جتنے بھی ریفارمر اٹھے سب کا مشترک نشانہ یہ تھا کہ انسانی سماج میں برابری لائی جائے — سماجی برابری، اقتصادی برابری، سیاسی برابری وغیرہ۔ مگر تمام مصلحین بظاہر کامیابی کے باوجود اصل مقصد کے حصول میں مکمل طور پر ناکام رہے۔ کارل مارکس کی غیر معمولی مقبولیت کے باوجود وہ اور اس کے متبعین سماج میں اقتصادی برابری لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ژان ژاک روسو بظاہر اپنی ساری کامیابی کے باوجود سماج میں سیاسی برابری لانے میں ناکام رہا۔ مہاتما گاندھی کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی مگر ان کی تحریک ملک کے اندر سماجی برابری قائم نہ کر سکی۔

اس عمومی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ یہ تمام ریفارمر ایک ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ سماج میں نابرابری کوئی بُرائی نہیں، وہ فطرت کا ایک عالمی قانون ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سماج میں نابرابری ہونا ایک رحمت کی بات ہے۔ یہ نابرابری لوگوں کے درمیان چیلنج کا سبب بنتی ہے، اور یہ چیلنج ہے جو لوگوں کو متحرک کرتا ہے اور ترقی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نابرابری کبھی یکساں

حالت میں نہیں رہتی، وہ ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ آج کا نابرابر کل برابر ہو جاتا ہے، اور آج کا برابر کل نابرابر بن جاتا ہے۔

یہی معاملہ اُس چیز کا ہے جس کا خوب صورت نام صنفی برابری (gender equality) رکھا گیا ہے۔ پچھلے تقریباً دو سو سال سے صنفی برابری کو قائم کرنے کے لیے طوفانی تحریکیں چل رہی ہیں۔ مگر عملاً یہ تحریکیں پوری طرح ناکام ہیں۔ اُس کا سبب یہ ہے کہ یہ نظریہ انتہائی حد تک غیر عملی نظریہ ہے۔ کیوں کہ فطرت نے عورت اور مرد دونوں کو ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے۔ ایسی حالت میں کوئی انسانی کوشش اِس فطری نظام کو بدلنے پر قادر نہیں ہو سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ فطرت کے نقشے کے مطابق، عورت اور مرد کے درمیان برابری (equality) کی نسبت نہیں ہے بلکہ ان کے درمیان نابرابری (inequality) کی نسبت ہے۔ دونوں صنفوں کے درمیان یہ فرق خود تخلیق کا حصہ ہے وہ کسی ظلم یا تعصب کا نتیجہ نہیں۔ تحقیق ثابت کرتی ہے کہ دونوں صنفوں کا خود جنیٹک کوڈ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ گویا کہ عورت اور مرد کے درمیان فرق کا سبب سوشل حالات نہیں ہیں بلکہ اِس کا سبب خود فطرت کا تخلیقی نظام ہے۔

اصل یہ ہے کہ زندگی کے نظام کو بخوبی طور پر چلانے کے لیے خالق نے یہ طریقہ رکھا ہے کہ عورت اور مرد دونوں مل کر زندگی کی گاڑی چلائیں۔ اِس معاملے میں عورت اور مرد کو جو رول ادا کرنا ہے اس کی بہترین صورت یہی تھی کہ دونوں میں الگ الگ صلاحیتیں رکھی جائیں۔ دونوں کے اندر اگر ایک ہی صلاحیت ہوتی تو وہ اپنا رول زیادہ بہتر طور پر ادا نہیں کر سکتے تھے۔ صحیح بات یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں رتبے کے اعتبار سے یکساں ہیں، لیکن استعداد کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے مختلف ہیں:

Equal in status, but defferent in role.

حیاتیات اور نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کی ساخت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ مثلاً مرد کے اندر حقیقت پسندی کا مزاج ہوتا ہے، جب کہ عورت کا حال یہ ہے کہ وہ

مقابلۃً اموشنل ہوتی ہے۔ مرد جسمانی اعتبار سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے، اور عورت اس کے مقابلے میں جسمانی اعتبار سے نازک ہوتی ہے۔

تحقیقات کے دَوران دونوں صنفوں کے درمیان ایک بہت بامعنیٰ فرق دریافت ہوا ہے۔ وہ یہ کہ مرد کا دماغ واحد رُخی (single focuced) ہوتا ہے اور عورت کا دماغ کئی رخی (multi focuced) ہوتا ہے۔ اِس فرق کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ زندگی میں کامیابی کے دو مختلف پہلوؤں کی رعایت ہو سکے۔ زندگی میں دونوں قسم کے رول کی ضرورت ہوتی ہے۔ فطرت نے تقسیم کار کے اصول پر ایک رول مرد کو دے دیا اور دوسرا رول عورت کو۔

کامیاب شوہر اور بیوی کی تعریف یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے فکری رفیق (intellectual partner) بن جائیں۔ نہ کہ محض جسمانی معنوں میں لَو پارٹنر (love partner) یا ہاؤس پارٹنر (house partner)۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ دو شخص ایک دوسرے کے لیے کامیاب فکری رفیق اسی وقت بن سکتے ہیں جب کہ دونوں مختلف انداز میں سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ کسی نے درست طور پر کہا ہے کہ جب ہر شخص ایک ڈھنگ پر سوچے تو کوئی بھی زیادہ نہیں سوچتا:

When every one thinks alike, no one thinks very much.

عورت اور مرد دونوں کے دماغ کی الگ الگ بناوٹ دونوں کو اِس قابل بناتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے کامیاب فکری رفیق بن سکیں، اور یہ مقصد بلاشبہہ صنفی نابرابری (gender-inequality) کے ذریعے حاصل ہوتا ہے نہ کہ صنفی برابری (gender equality) کے ذریعے۔

خلاصۂ کلام

عام طور پر لوگ باڈی ڈیولپمنٹ اور پرسنالٹی ڈیولپمنٹ کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ وہ پرسنالٹی ڈیولپمنٹ کے لفظ کو باڈی ڈیولپمنٹ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ باڈی ڈیولپمنٹ کا تعلق زیادہ درست طور پر آدمی کی داخلی شخصیت کے ڈیولپمنٹ سے ہے۔

کسی عورت یا مرد کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو جانے کہ پرسنالٹی ڈیولپمنٹ ہی اس کا سب سے بڑا نشانہ ہے۔ ڈیولپڈ پرسنالٹی کو دوسرے الفاظ میں پاکیزہ روح (purified soul) کہا جا سکتا ہے۔ موجودہ دنیا میں کسی آدمی کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو ارتقا یافتہ شخصیت بنائے۔ وہ پرسنالٹی ڈیولپمنٹ کے کورس سے گزار کر اپنے آپ کو اس قابل بنائے کہ وہ اُن منتخب لوگوں کے پڑوس میں جگہ پا سکے جو موت کے بعد کی ابدی دنیا میں بنائی جانے والے ہے۔

یہ ترقی یافتہ شخصیت وہ ہے جس کے اندر مثبت سوچ (positive thinking) ہو۔ جس نے اس بات کا ثبوت دیا ہو کہ وہ منفی تجربات کو مثبت نتیجے میں ڈھال سکتا ہے۔ جس کی روح، امن اور انسانیت کے اعلیٰ جذبات سے بھری ہوئی ہو۔ جس نے اپنے اندر خدائی اخلاقیات کی پرورش کی ہو۔

اس پرسنالٹی ڈیولپمنٹ کے لیے جو چیزیں سب سے زیادہ ضروری ہیں وہ ہیں سنجیدگی، دیانت داری، انصاف اور عمومی خیر خواہی جیسے جذبات۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر یکطرفہ اخلاقیات کی صلاحیت پائی جاتی ہو۔ وہ دوطرفہ اخلاقیات کا مزاج اپنے اندر نہ رکھتا ہو۔

پرسنالٹی ڈیولپمنٹ کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اندر اعلیٰ ذوق رکھتا ہو۔ وہ سطحی دلچسپیوں سے اوپر اٹھ گیا ہو، وہ تفریح کے بجائے تعمیر میں یقین رکھتا ہو۔ وہ وقتی مفاد کے بجائے دور تر مفاد کو اپنا مقصود بنا سکے۔ ارتقاء یافتہ شخصیت بنانا ایک عظیم قربانی کا طالب ہے، جسمانی قربانی نہیں بلکہ فکر اور جذبات کی قربانی۔ اس قربانی کے بغیر کوئی انسان ترقی یافتہ شخصیت کے درجے کو نہیں پا سکتا۔



ISLAMIC STUDIES

GOODWORD

www.goodwordbooks.com

ISBN: 978-81-7898-654-8

9 788178 986548